مولانا عبید اللہ سندھیؒ

اور

اُن کے چند معاصر



مؤلف

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے چند معاصر

دار العلوم دیوبند سے اخراج کا قضیۂ نامرضیہ

مؤلف : ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

ناشر : مولانا عبید اللہ سندھی اکادمی پاکستان کراچی ۷۵۸۰۰

طابع : المخزن پرنٹرز پاکستان، کراچی

اشاعت : ۲۰۰۰ء

قیمت : ۰۰۰ روپے

ملنے کے پتے

مکتبۂ شاہد

۱/۹ علی گڑھ کالونی۔ کراچی ۷۵۸۰۰

مکتبۂ رشیدیہ

عائشہ منزل، نزد مقدس مسجد۔ اردو بازار۔ کراچی

دار الکتاب

عزیز مارکیٹ، اردو بازار۔ لاہور

فہرست

انتساب

جب نام ترا لیجے تب آنکھ بھر آوے
اس طرح سے جینے کو کہاں سے جگر آوے

(سوداؔ)

مولانا سعید الرحمٰن علوی مرحوم کے انتقال کو کئی برس گزر گئے لیکن ان کا معاملہ آج تک کچھ اسی قسم کا ہے۔ اللہ تعالیٰ انھیں غریقِ رحمت فرمائے۔ آمین!

ابو سلمان شاہ جہان پوری

پیش لفظ

مولانا عبید اللہ سندھی اکادمی پاکستان

۹/۱ علی گڑھ کالونی۔ کراچی ۷۵۸۰۰

تاریخ: ۱۰ر نومبر ۱۹۹۹ء حوالہ: ________

باسمہٖ سبحانہ وتعالیٰ

حضرت مخدومی!

امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ (ف ۱۹۴۴ء دین پور) اور دار العلوم دیوبند میں مولانا مرحوم کے خلاف اٹھائے جانے والے فتنے کے متعلق جو کتاب زیرِ تالیف تھی اور جس کا ابتدائی مسودہ الولی (حیدر آباد) میں چھپ بھی گیا تھا، بہت کچھ ترمیم اور اضافوں کے بعد پریس میں دی جا رہی ہے۔ اب اس کی اشاعت میں بہ ظاہر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

تحقیق کے دوران نئے انکشافات ہوئے اور بعض حقائق سامنے آئے۔ حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ (ف ۱۹۵۷ء دیوبند) نے جن بزرگوں کے سیاسی افکار اور فتوؤں کا رد کیا تھا اور جنھیں سیاسی ذوق و فہم سے تہی دامن قرار دیا تھا، یا جن کے ایمان میں شبہے کا اظہار کیا تھا، یا جن حضرات کے بیان کو تلبیس و کذب کا مصداق قرار دیا تھا، تو یہ کوئی غصے یا محض جوش و جذبات کی بات نہ تھی، بلکہ حضرت کے مشاہدے اور رائے کی اصابت پر مبنی واقعے کا اظہار تھا، جو حضرت کی زبانِ مبارک سے ہوا تھا اور بہ حکم، قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید! حضرت کے شبہات حقیقت اور ایرادات درست تھے۔

ادھر میں نے مورخِ اسلام اور مفکرِ دوراں حضرت مولانا سید محمد میاں نور اللہ مرقدہ (ف ۱۹۷۵ء دہلی) کی تمام مختصر سیاسی نگارشات؛ کتابچے، رسالے اور بہت سے مضامین و تنقیدات جو اخبارات میں چھپی تھیں، لیکن ان کی ترتیب و تدوین کی نوبت نہ آسکی تھی، اپنی معلومات کی حد تک سب کو یا کم از کم بیشتر کو مدون کر دیا ہے۔ ان کے مطالعے سے، نیز دوسرے مآخذ میں تحقیق و نظر سے اندازہ ہوا کہ آپ نے جن بزرگوں کے سیاسی تدبر و بصیرت کی قیمت صفر قرار دی تھی، وہ بہت زیادہ تھی۔

مطالعے کے دوران حضرت تھانوی (ف ۱۹۴۳ء تھانہ بھون) اور حضرت عثمانی (ف ۱۹۴۹ء، بہاول پور) رحمہما اللہ کے علاوہ مولوی محمد طاہر (ف ۱۹۵۲ء کراچی)، مولوی شبیر علی تھانوی (ف ۱۹۶۸ء کراچی، مفتی محمد شفیع (ف ۱۹۷۶ء کراچی) اور بعض دیگر بزرگوں (رحمہم اللہ) کی سیرت اور افکارِ سیاسی کے متعلق معلومات کا ایک ذخیرہ جمع ہو گیا ہے۔ اول الذکر دو بزرگوں اور آخر الذکر بزرگ کے بارے میں مباحث کو صرف سیاسی افکار و سیرت و خدمات تک محدود رکھا ہے۔ دینی، اصلاحی، علمی اور حدیث، تفسیر، فقہ اور درس و افتا میں ان بزرگوں کی خدمات اظہر من الشمس اور بحث و نظر سے ماوراء ہیں۔

میں نے کوشش کی ہے کہ کوئی بات اپنی طرف سے نہ کہی جائے، جو شک کسی کے ایمان کی سلامتی کے بارے میں یا جو بات کسی کے اخلاق و دیانت، یا ایراد کسی کی اصابت رائے یا سیاسی فہم کا حضرت شیخ الاسلام، مولانا سید محمد میاں اور دیگر اصحابِ علم و نظر اور اہلِ قلم نے لکھا ہے، اس کو بیان کر کے اس کے ثبوت فراہم کر دیے جائیں۔

خدا کرے مزاج سامی بخیر ہوں، صاحب زادۂ محترم مولانا محمد فیاض خان سلمہ الرحمٰن، وابستگانِ دامنِ فکر اور اہل مدرسہ کی خدمت میں سلام مسنون۔

آج پچھلے کئی ماہ کے بعد رسائل پر نظر پڑی اور یہ معلوم ہو کر تعجب ہوا کہ ان میں ماہنامہ "نصرۃ العلوم" موجود نہیں! اب خیال آتا ہے کہ وہ تو کئی ماہ ہو گئے، نہیں آتا ہے۔ معلوم نہیں کیا معاملہ ہے؟

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

دعاؤں کا طالب خاکسار

ابو سلمان

بہ شرفِ نظر

حضرت شیخ الحدیث مولانا صوفی عبد الحمید سواتی صاحب دامت برکاتہم

مدرسہ نصرۃ العلوم

گوجرانوالہ

دار العلوم دیوبند

ہندوستان میں عظمتِ اسلام کی ایک زندہ جاوید یادگار

دار العلوم دیوبند کا نام زبان پر آتا ہے تو تصور صرف ایک دینی مدرسے کے دایرے تک محدود نہیں رہتا۔ دار العلوم معقول و منقول کی محض ایک رسمی و روایتی درس گاہ نہیں، بلکہ وہ بہت سے تعلیمی، ثقافتی، علمی، سیاسی اداروں اور تحریکوں کا جامع ہے۔ یہ ہندوستان کی سرزمین میں وہ شجرہ طیبہ ہے جس کی جڑیں گہرائیوں میں چھپی ہوئی ہیں، اس کی شاخیں فضا میں دور دور تک پھیل گئی ہیں، اس کا سایہ راستہ چلنے والوں کے لیے سکون و طمانیت کا باعث ہوا ہے اور اس کے ثمرات شیریں نے ملت اسلامیہ کے ذوق معنوی کو تسکین بخشی ہے۔ وہ تاریخ کے کئی نشیب و فراز سے گزرا۔ اسے زندگی میں کئی دشوار گذار مراحل پیش آئے۔ دشمن تو دشمن ہی تھے انھوں نے اس کے وجود کو مٹانے کی کوششوں میں کمی نہیں کی۔ اپنوں کی کوتاہ نظری نے بھی اس کے امتیازات کو ملیامیٹ کرنے میں نادانیوں کی مثال قائم کر دی، لیکن اس شجرہ طیبہ کی شاخوں کا گھنا سایہ نہ نادانوں پر سمٹا نہ بیگانوں پر تنگ ہوا۔ اس کے ثمرات تعلیم و تربیت سے سب نے فیض اٹھایا۔ اس کے اسلاف و اخلاف کا ذوق خدمت بلا تمیز مذہب و ملت سب کے لیے فیضان عام تھا۔ اس کے متقدمین اسلامی اطوار اور انسانی اوصاف کا بہترین نمونہ تھے تو اس کے متوسطین اور متاخرین بھی زندگی کے ہر دایرہ عمل میں اپنے اسلاف کے صحیح جانشین اور ان کی روایات کے امین تھے۔ اس کے اکابر تو ہر دایرہ علم و عمل میں اکابر ہی تھے۔ اس کے اصاغر و اخلاف کی سیرتوں کی پختگی و تابانی اور ایثار و قربانی کی مثالوں نے بھی زندگی کی

کٹھنائیوں میں قوم کے عزائم کو پختہ کیا اور حوصلوں کو مضبوط اور ہمتوں کو بلند رکھا۔

اللہ تعالیٰ نے انھیں ایمان کی **محکمی**، عقاید کی صحت، علم کے رسوخ، نظر کی بلندی، قلب کی وسعت، ذہن کی فراخی، اور سیرت میں اعتدال، عمل میں استقامت اور دین ودنیا کے توازن کی بہترین خوبیوں سے نوازا تھا۔ ان کا ایک ایک فرد حسن سیرت کی مثال، اخلاق کا مجسمہ، عمل کا پیکر اور ایثار کا نمونہ تھا۔ وہ فرشتے نہیں تھے، لیکن ایسے نیک سرشت تھے کہ فرشتے ان پر رشک کریں۔ ان میں کوئی معصوم نہ تھا، لیکن نیک نفسی، پاکیزگی عمل، سلامت روی، خوش خلقی، تقوی وتدین اور بر واحسان کے خصایص وخصایل سے ان کی زندگیاں آراستہ تھیں۔ وہ خود اپنی مثال اور آپ اپنا نمونہ تھے۔ علوم وفنون کے مختلف میدانوں میں اور خدمات قومی وملی کے مختلف دایروں میں دوسرے مذاہب وفرق کے بڑے بڑے لوگ پیدا ہوئے اور تاریخ میں اپنا نام یادگار چھوڑ گئے، لیکن بہ حیثیت مجموعی کسی ایک جماعت اور مکتبہ فکر کے ہر دور میں خصایص علم وعمل کے اتنے اعلیٰ درجات پر اتنی بڑی تعداد کہیں نہ ملے گی۔ وہ ایک عظیم الشان سلسلہ ذہب ہے، جس کی ہر کڑی اپنی ماسبق سے زیادہ شان دار نظر آتی ہے۔ وہ تعلیم وتربیت کی ایسی ٹیکسال ہے، جس کے کھوٹے بھی دوسروں سے زیادہ کھرے نکلے۔ اس کی تعمیر کے حسن اور منظر کی دل ربائی نے دیکھنے والوں کو سرور بخشا ہے۔ اس کا وجود سرزمین ہند میں عظمت اسلام کی ایک زندہ اور مقدس یادگار ہے۔ وہ ایک باران رحمت تھا جس نے مسلمانوں کی کھیتیوں ہی کو سیراب نہیں کیا، اس سے بہ قدر ذوق واستعداد غیر مسلم سوسائٹی بھی مستفیض ہوئی اور جس کا فیضان ہندوستان کے کناروں سے نکل کر ایشیا اور افریقہ ویورپ کے دور دراز ممالک اور ان کے دیار وامصار تک پھیلتا چلا گیا۔ وہ ایک سلسبیل تھی جس کا عرفان کسی کو تھا یا نہیں، لیکن اس کا فیضان عام تھا اور اس نے ملت کی سب کھیتیوں کو سیراب کیا۔

اس کے وجود کا خمیر صبر وتوکل اور اخلاص وللہیت کی مٹی سے اٹھا تھا، اس لیے عند اللہ وہ ہمیشہ مقبول رہا اور عند الناس اسے ہر دور میں عزت اور

مرجعیت کا مقام حاصل رہا۔ تاریخ کے سنین وشہور کا شمار کیجے تو اس کے قیام پر ایک سو تیس برس سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ اس کا وجود ۱۸۶۶ء میں نقش پذیر ہوا تھا۔ اس وقت سے اب تک برعظیم پاک وہند کی تاریخ مذہب وسیاست میں وہ اسلام اور مسلمانوں کی شان اور عظمت کی علامت کے طور پر اپنا سر اونچا کیے ہوئے کھڑا ہے۔ اس مدت میں حوادث کے کتنے ہی طوفان آئے اور اس کے سروشانہ سے ٹکرا کر اور اس کے جیب وداماں سے کھیل کر گزر گئے۔ زمانے کی شکست وریخت نے دنیا کا نقشہ بدل دیا، انقلابات نے عظیم ہندوستان کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا۔ بعض نادان یہ سمجھتے تھے کہ عظمت اسلام کی یہ یادگار ان حوادث میں اپنا وجود برقرار اور تشخص قایم نہ رکھ سکے گی، لیکن دنیا نے دیکھا کہ وقت آیا تو حوادث نے اپنا راستہ بدل لیا، خطرات موہوم ثابت ہوئے، اس کی ہستی مزید بلند ہوئی اور اس کی اہمیت اور بڑھ گئی۔ اس کی زندگی کی ہر آنے والی صبح روشن تر از سابق ثابت ہوئی۔ ۱۹۴۷ء کے حوادث کے بعد بھی اگر ایشیا میں ہندوستان کی سرزمین میں مسلمانوں کی تہذیب وثقافت کا کوئی اجلا نقش اور وطن وملت کی خدمت کا کوئی یادگار مرکز، جس کا ہر دور شان دار، جس کا ہر فیصلہ مستحسن اور جس کا وجود فی نفسہ قابل فخر نظر آتا ہے، تو وہ صرف دارالعلوم دیوبند ہے۔ اس کا قیام و وجود مشیت ایزدی کی نمود اور منشاے خداوندی کا اظہار تھا۔ اس لیے انقلاب اور زمانے کی شکست وریخت کا اس کے وجود پر کوئی اثر نہ پڑا۔ دارالعلوم تاریخ کا ایک روشن باب ہی نہیں بلکہ برعظیم کے مسلمانوں کی دینی وتعلیمی، علمی وتہذیبی اور سیاسی ملی تاریخ کے ایک جلی نقش کا نام ہے۔ اگر دارالعلوم دیوبند کی تاریخ کو نظرانداز کر دیا جائے تو برعظیم کے مسلمانوں کی تاریخ ثقافت وسیاست کا تمام قابل فخر سرمایہ نظروں سے چھپ جاتا ہے، دینی خدمات نہ ہونے کے برابر رہ جاتی ہیں اور ملک کی آزادی، ملت اسلامیہ کی سربلندی، اسلامی علوم وثقافت کے تحفظ کی جدوجہد اور عزیمت دعوت کی تاریخ میں ایک طبقے کی گداگری، ایک جماعت کی منت گذاریوں اور ایک گروہ کی ملت فروشیوں اور غداریوں کے سوا کچھ بھی نہیں رہ جاتا۔

دارالعلوم دیوبند ایک سرچشمہ تھا، جس کی فیض رسانیوں اور نفع بخشیوں نے ملت کے نخل امید کو سرسبز وشاداب کر دیا اور زندگی کے ہر گوشے اور علم وعمل کے ہر میدان میں ملت اسلامیہ کے دماغوں کو افکار حقہ اور دلوں کو امنگوں اور ولولوں سے معمور کر دیا اس نے مسلمانوں کے سامنے زندگی کے ہر گوشے میں راہ عمل کھولی اور اپنے اخلاق اور سیرت کی روشنی سے راہوں کو منور کر دیا۔ مسلمان چاہیں تو وہ نئے حالات میں یمین ویسار کے تذبذب کے بغیر پورے اعتماد کے ساتھ زندگی کا سفر طے کر سکتے ہیں اور منزل مقصود تک پہنچ سکتے ہیں۔

مقصد قیام:

دارالعلوم دیوبند کی خدمات کے متعدد پہلو ہیں اور ہر پہلو روشن اور تابناک! اس نے علوم دینیہ کی تعلیم واشاعت میں جو کارنامہ انجام دیا اس کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا کوئی دور دراز گوشہ ایسا نہیں ہوسکتا، جہاں مسلمان ہوں اور عقاید واخلاق وسیرت اسلامی میں دیوبند کے اکابر اور فیض یافتگان کے دست تعلیم وتربیت کا کوئی اثر موجود نہ ہو۔ دنیا کی نظروں میں دارالعلوم دیوبند کے قیام کا خاص مقصد علوم دینیہ کی اشاعت وتعلیم تھا۔ اور اگر صرف یہی مقصد تھا تب بھی مسلمانوں کی علمی وعملی زندگی کا کون سا گوشہ، ذہنی وفکری تربیت کا کون سا اصول، اسلامی تہذیب وثقافت کے تحفظ کا کون سا کام، اخلاق وسیرت کی تعمیر کی کون سی ضرورت، دین ودنیا کی بھلائی کا کون سا میدان اور فلاح فرد وملت کے نصب العین کا کون سا پہلو تھا، جو اس میں نہیں آگیا۔

لیکن اگر کسی کو اصرار ہو کہ تاریخ کے حروف وسواد میں اس کے مقاصد قیام کے دیگر خصایص بھی بتلا دیے جائیں تو جان لینا چاہیے کہ اس کا قیام ہندوستان میں مسلمانوں کے کھوئے ہوئے وقار کا حصول اور قیام ملت اسلامیہ ہندیہ کی تدابیر کے لیے ایک مرکز اور نظام فکر کے ایک بنیادی نقطے کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے دارالعلوم کے قیام کے پس منظر اور مقصد کے بارے میں ”سوانح قاسمی“ میں بہ تفصیل لکھا ہے۔

یہاں مختصراً عرض کیا جاتا ہے۔

۱۔ پس منظر کے بارے میں لکھتے ہیں:

جس وقت شاملی کے میدان سے وہ خود (حضرت قاسم نانوتوی) اور ان کے رفقاء کار بہ ظاہر ناکامی کے ساتھ واپس ہوئے تو... یہ واپسی "متحرفا لقتال اور متحیزا الی فئته (انفال) جنگ ہی کے لیے کتراتے ہوئے یا کسی ٹولی سے ملنے کے لیے ہو سکتی تھی اور یقیناً اسی کے لیے تھی"۔

(سوانح قاسمی: ج ۲، ص ۲۲۳-۲۲۲)

۲۔ مقصد کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ (حضرت نانوتوی) کا دماغ مصروف ہوگیا۔ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام، اس لائحہ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی اور جوہری عنصر تھا۔"

(ایضاً، ص ۲۲۳)

۳۔ حضرت مولانا سید محمد میاں رہ نے لکھا ہے کہ جب حاجی رفیع الدین نے مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ رہ کی خدمت میں عرض کیا کہ انھوں نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے، اس کے لیے دعا فرمائیں تو آپ نے عرض کیا:

"سبحان اللہ آپ فرماتے ہیں ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے! یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سربہ سجود ہوکر گڑگڑائی ہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقاے اسلام اور تحفظ علم دین کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔"

(علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے ج ۱، ص ۷۱)

۴۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رہ نے لکھا ہے کہ جب انھوں نے ایک مرتبہ حضرت شیخ الہند رہ سے دریافت فرمایا کہ سیاسیات میں حضرت کا مسلک کیا ہے؟ تو حضرت پر ایک خاص کیفیت طاری ہوگئی اور حضرت نے فرمایا:

"حضرت الاستاذ (حضرت نانوتوی) نے اس مدرسے کو

کیا درس و تدریس اور تعلیم تعلّم کے لیے قایم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز ہو جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے، تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔"

(سوانح قاسمی، ج ۲، ص ۲۲۶)

مولانا گیلانی رحمہ نے اسے دارالعلوم کی "اساسی خصوصیت" قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مدرسہ دیوبند کی یہی وہ "اساسی خصوصیت" تھی، جس نے اس مدرسے کے تمام کاروبار حتی کہ تعلیم میں بھی ایسی ہی حریت پرور خصوصیات پیدا کیں اور وہ دینی اور مذہبی حمیت اور غیرت کا ہند گیر ہی نہیں، عالم گیر جامعہ اور اقامتی ادارہ بن گیا۔ اس کے فضلا کا ایک خاص مکتب خیال نمایاں ہوا اور اس کے مستفیدیں ایک ایسا خاص ملا جلا اور مرکب نصب العین لے کر باہر نکلے، جس میں سب پر چھا جانے کی اسپرٹ موجود تھی۔"

اب تو دارالعلوم کے ان اصحاب رخصت نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے جن کے بزرگ سیاست کے نام سے کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ یہ بات کچھ حضرت شیخ الہند رحمہ یا کسی استاد کے دل میں چھپی ہوئی نہ رہی تھی، بلکہ غیر درسی طور پر حضرت کے ذہن سے نکل کر تلامذہ کی زبانوں تک پہنچ چکی تھی۔ چناں چہ ۱۹۰۵ء کے آغاز میں سر جیمس ڈگس لاٹوش جب دارالعلوم دیکھنے کے لیے دیوبند آئے اور اساتذہ سے ملے، طلبہ سے بات چیت کی اور دارالعلوم کی تعلیم کی غرض غایت دریافت کی اور ان کی اپنی زندگی کا مقصد پوچھا، تو انھوں نے جواب دیا:

"ہمارا نصب العین احیاے دین اور خدمت ملک و ملت ہے۔"

(تاریخ دارالعلوم دیوبند، از سید محبوب رضوی، کراچی، ۱۹۸۹، ج ا، ص ۲۰۹)

یہ ۱۹۰۵ء کے آغاز کی بات ہے۔ اس کے بارے میں اگر ۱۹۱۵ء میں کوئی شخص کہتا ہے کہ اس کا مقصد صرف اور صرف مذہبی تعلیم کی آزادی

ہے، سیاست سے اس کو کوئی غرض نہیں یا آج کوئی پوچھتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا کیا مقصد تھا تو اس سادگی پر حیرت اور تجاہل پر افسوس ہوتا ہے۔ آخر یہ انداز گفتگو کیا ہے اور اس پوچھنے کا کیا مقصد ہے؟

اگر کسی کو مزید اصرار ہو کہ اس کی خدمات کے ہر پہلو پر وقت کے اصول تالیف و تصنیف کے مطابق الگ الگ بحث کی جائے۔ تو اس صحبت میں بھی گنجایش و فرصت کے مطابق اس کی خصوصیات کے مختلف پہلوؤں کی طرف ضروری اشارات کیے جاسکتے ہیں۔

مدارس کے قیام کی ہمہ گیر تحریک:

دارالعلوم دیوبند ملت کے چند بہی خواہوں نے جن مقاصد کے لیے قائم کیا تھا، وہ مقاصد سہارن پور کے ایک گم نام قریے میں صرف ایک مدرسہ قائم کر دینے سے پورے نہیں ہوسکتے تھے۔ ضرورت تھی کہ اس جذبے کو عام کیا جائے اور مدارس دینی کا ایک جال پورے ملک میں پھیلا دیا جائے۔ چناں چہ دارالعلوم کے بانیان کرام نے ایک ایسا دینی تعلیمی جذبہ پیدا کیا کہ اسی زمانے میں ملک کے طول و عرض میں کئی مدرسے قائم ہوئے ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں "مدرسہ قاسمیہ، مراد آباد" کا قیام عمل میں آیا، جو اب عام طور پر "مدرسہ شاہی مسجد" کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی بنیاد حضرت قاسم العلوم حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ کے مقدس ہاتھوں سے رکھی گئی۔ اس کے چند سال بعد حضرت قاسم العلوم ہی کے ایما و تحریک پر "جامعہ اسلامیہ عربیہ" کے نام سے امروہہ میں ایک مدرسہ قائم کیا گیا۔ نگینہ (یو۔ پی) میں ۱۲۹۲ھ سے ایک مکتب قائم تھا حضرت حجۃ الاسلام رحمہ اللہ کے مشورے سے اسے ترقی دے کر علوم اسلامی کی ایک قابل فخر درس گاہ بنا دیا گیا اور حضرت ہی کے نام پر اس کا نام "مدرسہ قاسمیہ عربیہ" رکھا گیا۔ "مظاہر العلوم، سہارن پور" کا قیام ۱۸۹۶ء میں عمل میں آیا۔ اس کے آغاز و بنا میں بھی بانیان دارالعلوم، دیوبند کے احباب و اخلاف کا حصہ تھا اور دارالعلوم دیوبند ہی کے مقاصد تعلیم و تربیت ہی اس کے مقاصد قرار پائے تھے۔ بانیان دارالعلوم دیوبند کے احباب اور شاہ محمد اسحاق اور حضرت مولانا عبدالحی و شاہ اسماعیل شہید رحمہم اللہ کے تلامذہ

میں سے مولانا سخاوت علی جون پوری نے جون پور میں گذشتہ صدی کے اواخر میں مدرسہ قرآنیہ قائم کیا۔

مدارس کے قیام کا یہ سلسلہ دارالعلوم، دیوبند کے آغاز ہی سے شروع ہو گیا تھا اور ملک کے طول وعرض میں متعدد مدارس قایم ہو چکے تھے، لیکن یہ چمن بندی کا آغاز تھا، فصل گل کا موسم ابھی دور تھا۔ اس موسم کا آغاز حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی علیہ الرحمتہ کے عہد سعادت سے ہوتا ہے آپ کے زمانے میں اور آپ کے تلامذہ کی کوششوں سے برعظیم پاک وہند کا چپہ چپہ علوم دینی کی ضیا پاشیوں سے جگمگا اٹھا اور ملی تحریکات اور ملک کی آزادی کی جدوجہد میں ایک نئی روح دوڑ گئی۔ آپ کے مساعی مشکور سے ملت کے مضمحل و منتشر قویٰ میں ایک نئی قوت اور اعضا وجوارح میں ایک نظم پیدا ہو گیا اور دارالعلوم کا فیضان عام ہوتا چلا گیا۔

۱۸۹۵ء میں مولانا رشید احمد رہ گنگوہی کے خلیفہ و مجاہد ملت حافظ محمد صالح، مولانا فضل احمد، منشی رحمت اللہ اور دیگر حضرات نے "مدرسہ رشیدیہ" کے نام سے رائے پور ضلع جالندھر میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ ۱۹۰۵ء میں "مدرسہ نعمانیہ" کے نام سے امرتسر میں اسی سلسلے کے وابستگان نے ایک دینی درس گاہ قایم کی۔

دہلی کی مشہور دینی درس گاہ "مدرسہ امینیہ" حضرت شیخ الہند کے شاگرد رشید مولانا امین الدین نے قایم کی اور دوسرے نامور شاگرد حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ شاہجہاں پوری ثم دہلوی کے اخلاص وایثار نے اسے ایشیا کی چند مشہور دینی جامعات کی صف میں شامل کر دیا۔ سندھ میں حضرت شیخ الہند کے نامور شاگرد مولانا عبید اللہ سندھی نے بمقام گوٹھ پیر جھنڈا (ضلع حیدر آباد) میں "دارالرشاد" کے نام سے ۱۹۰۱ء میں ایک مدرسہ قایم کیا، پھر ۱۹۱۲ء میں اسی نام سے نواب شاہ (سندھ) میں ایک مدرسہ قایم کیا، اس سے پہلے ۱۸۸۴ء میں مولوی عبد اللہ مرحوم نے ایک مدرسہ کراچی کے محلّہ کھڈہ میں قایم کیا تھا۔ مرحوم کے فرزند ارجمند مولانا محمد صادق حضرت شیخ الہند رہ کے ارشد تلامذہ میں سے ایک تھے جنھوں نے سندھ میں علوم اسلامی کی ترویج

واشاعت، تبلیغ اسلام، ردبدعات ومحدثات اور تحریک آزادی میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ مولانا محمد صادق کے مساعی حسنہ کا مرکز ان کے والد کا قایم کردہ مدرسہ تھا، جو تاریخ میں "مدرسہ مظہر العلوم" کے نام سے مشہور ہے۔ لاہور میں حضرت شیخ الہند کے شاگرد رشید مولانا احمد علی لاہوری نے جو علوم قرآنی میں اپنے امتیاز وتبحر کی بنا پر شیخ التفسیر کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں، ۱۹۲۴ء میں "مدرسہ قاسم العلوم" کے نام سے علوم دینی کی ایک درس گاہ کا آغاز کیا۔ ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۲ء) میں ڈھابیل (سورت) میں "جامعہ اسلامیہ" کے نام سے مولانا انور شاہ کاشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی کی کوششوں سے ایک اسلامی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا، جس نے بہت تھوڑی مدت میں دینی وتعلیمی حلقوں میں اعتماد پیدا کر لیا۔ حضرت شیخ الہند کے تلامذہ کی صف میں ہر دو حضرات کسی تعارف کے محتاج نہیں، ۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں سرائے میر (ضلع اعظم گڑھ) میں چند مخلصین ملت نے جو اس سے پہلے انجمن اصلاح قائم کر چکے تھے، ایک دینی مدرسہ قایم کیا، جس کا سنگ بنیاد حضرت شیخ الہند کے شاگرد مولانا سید میاں اصغر حسین دیوبندی کے مبارک ہاتھوں سے رکھا گیا۔ ۱۹۲۴ء میں گجرات کے ضلع کھیڑ میں آنند کے مقام پر حضرت مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ علیہ الرحمہ کے ہاتھوں "جامعہ عربیہ تعلیم الاسلام" کے نام سے ایک مدرسے کی بنیاد پڑی، جس نے گجرات کے علاقے میں علوم دینی کی اشاعت اور تبلیغ اسلام میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ۱۹۱۳ء حضرت شیخ الہند رہ کے مشورے سے مولانا عبید اللہ سندھی نے دہلی میں "مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ" کے نام سے ایک مدرسہ قایم کیا۔ اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا مدرسہ تھا، جس میں دو تین استاد درس قرآن وحدیث کی خدمت میں مصروف تھے اور ایک خاص جماعت جو دار العلوم دیوبند اور علی گڑھ کالج کے فارغین پر مشتمل تھی، مولانا سندھی مرحوم کے زیر تعلیم وتربیت تھی، لیکن انگریزی حکومت اس چھوٹے سے ادارے سے جس طرح لرزہ براندام تھی اس کا کچھ اندازہ "تحریک شیخ الہند" کے مطالعے سے ہوتا ہے۔ ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۲ء) میں مدرسہ دینیہ اسلامیہ، غازی پور، ملت کے چند بہی خواہوں اور علوم اسلامی کے شائقین کے

ہاتھوں قایم ہوا، لیکن اس کا نظام تعلیم و تدریس دارالعلوم سے مستعار اور زمام تعلیم و تدریس شروع سے اب تک فاضلین دیوبند کے ہاتھوں میں رہی ہے۔ غازی پور کا مشہور اور تاریخی مدرسہ "مدرسہ چشمہ رحمت" ۱۸۶۹ء میں قایم ہوا اگرچہ اس کے بانیوں کا پہلا تعلق علماے فرنگی محل سے تھا، لیکن آغاز کے بعد مدرسہ ہر دور میں فرزندان دارالعلوم دیوبند کے مساعی اور خدمات کا منت گزار رہا ہے۔ جون پور کے قصبہ صبرحد کی مثالی درس گاہ "مدرسہ فاروقیہ" کی تعلیمی واصلاحی روح وہی ہے، جو دارالعلوم دیوبند کے نظام تعلیم و تربیت میں رواں ہے۔ پٹنہ کے مشہور و معروف "مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ" کا قیام ۱۹۱۲ء اور اس کی ترقی دارالعلوم دیوبند کے چشمہ علم و عرفان سے سیراب ہونے والوں کی رہین منت ہے۔ اس سلسلے میں "جامعہ ملیہ نواکھالی" کا ذکر بھی ضروری ہے اسے دارالعلوم دیوبند کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے۔ اس کے امتحانات اور کارگذاری کی نگرانی دارالعلوم کی طرف سے ہوتی ہے۔

یہ عہد سعادت تو حضرت شیخ الہند اور آپ کے تلامذہ کا دور تھا۔ یہ تحریک اس دور کے بعد ختم نہیں ہوگئی بلک گذشتہ ۲۵، ۳۰ سال کے عرصے میں پاکستان کے مختلف شہروں میں چند ایسے دینی مدارس کا قیام عمل میں آیا ہے جن کے ذکر کے بغیر یہ مضمون مکمل نہیں ہو سکتا۔ ان مدارس میں جامعہ اشرفیہ، لاہور (۱۹۴۷ء) جامعہ رشیدیہ ساہیول (۱۹۴۷ء) دارالعلوم خیر المدارس، ملتان (۱۹۴۷ء) دارالعلوم حقانیہ، اکوڑہ خٹک (۱۹۴۷ء) دارالعلوم الاسلامیہ، ٹنڈوالہ یار حیدرآباد (۱۹۴۷ء) دارالعلوم، کراچی (۱۹۵۰ء) جامعہ اشرفیہ، پشاور (۱۹۵۳ء) جامعہ مدنیہ، لاہور (۱۹۵۵ء) مدرسہ عربیہ اسلامیہ نیوٹاؤن کراچی (۱۹۵۵ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ لیکن اس سلسلہ ذہب کی یہ آخری کڑیاں نہیں ہیں۔ ان مدارس کے بعد بھی بے شمار مدارس پاکستان کے طول و عرض اور ہندوستان اور بنگلہ دیش کے دور دراز علاقوں میں قایم ہوئے ہیں۔

یہ تمام ادارے برعظیم میں علوم اسلامی کی تعلیم و تدریس، اسلامی شعائر اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ، ملک کی آزادی کی جدجہد اور ملی تحریکات اور

اسلامی علوم وفنون کی ترویج واشاعت کی تاریخ میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ یہ تمام مدارس اپنا اپنا جداگانہ اور مستقل نظام اور حلقہ اثر رکھتے تھے لیکن ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش میں اسلامی تعلیم وتربیت کے نظام میں دارالعلوم دیوبند اور ان اداروں کا تعلق وہی تھا جو نظام فلکی میں سورج اور دوسرے سیاروں کا ہے۔

ان سطروں کے مطالعے سے دارالعلوم دیوبند کے دایرہ فیضان کا جو تصور ذہن میں قایم ہوتا ہے، وہ حقیقت کے مقابلے میں بہت کم ہے۔ بات یہ ہے کہ ابھی تک اس موضوع پر کوئی کام ہی نہیں کیا گیا اور کوئی سنجیدہ کوشش ایسی نہیں کی گئی ہے، جس سے دارالعلوم دیوبند کے افادہ وفیضان کا واقعی اندازہ ہوسکے۔

یہ تو دارالعلوم، دیوبند کے سلسلے کے چند خاص مدرسے تھے، لیکن اگر صوبہ یا علاقہ وار جائزہ لیا جائے تو صرف ایک مضمون اس مواد کا متحمل نہیں ہوسکتا، اس کے لیے ایک کتاب کی ضرورت ہوگی، ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کا کون سا گوشہ ایسا ہے، جہاں دارالعلوم دیوبند کے سلسلے کا چھوٹا یا بڑا کوئی مدرسہ قایم نہیں ہے۔ ہندوستان میں اہم مدارس کی ایک مختصر سی فہرست غلام رسول نے مرتب کی ہے۔ دوسری فہرست جو بہار واڑیسہ کے اہم مدارس کی ہے پروفیسر عبدالمنان کی کوشش کا نتیجہ ہے۔ گجرات کے باکمال اور برگزیدہ علمائے کرام کی دینی خدمات کا ایک مختصر جائزہ حضرت مفتی اعظم محمد کفایت اللہ نے لیا ہے اس طرح مالابار میں دینی تعلیم کی مرکزی درس گاہوں کے بارے میں محمد اسلم نے معلومات فراہم کی ہیں۔ (ان مضامین کے لیے دیکھیے البلاغ بمبئی، تعلیمی نمبر) سابق مغربی پاکستان (موجوہ پاکستان) کے عربی مدارس کا ایک مفصل جایزہ حافظ نذر احمد نے مرتب کیا۔ "علم وآگہی" کراچی کے دو ضخیم نمبروں (برصغیر پاک وہند کے علمی، ادبی اور تعلیمی ادارے جلد اول دوم) میں دیوبندی مکتبہ فکر کے بہت سے تعلیمی اور علمی ادبی اداروں اور انجمنوں کے حالات سمیٹ لیے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں "برگ گل" کراچی کا تعلیمی پلیسی نمبر بھی قابل توجہ ہے۔ ان کتب ورسائل میں مدارس کی تاریخ اور اس کے

بانیوں کے حالات کے مطالعے سے بخوبی اندازہ ہوسکتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی فیض رسانیوں اور اس کے اکابر و اصاغر کی نفع بخشیوں کا دایرہ کتنا وسیع ہے!

دارالعلوم دیوبند کے اثرات:

قدیم وجدید کی تفریق ہندوستان پاکستان میں مسلمانوں کی ملی زندگی کا ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ دیوبند کو قدامت کا پرستار اور علی گڑھ کو جدت کا والہ وشیدا بتایا گیا ہے۔ اس خلیج کو پاٹنے کی مختلف دردمندان قوم نے کوشش کی۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ الزام جدت کے پرستاروں کی طرف سے اور قدیم وجدید کے مابین خلیج کو پاٹنے کی تمام تر کوششیں قدامت پرستوں کی طرف سے عمل میں آئی ہیں۔ ندوۃ العلماء اس کی ایک مثال ہے، جس کے محرکوں اور بانیوں میں دیوبند کے سلسلے کے بزرگ واکابر نمایاں ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے دیوبند اور علی گڑھ کے مابین خلیج کو پاٹنے کی نہایت مخلصانہ کوششیں کیں۔ علی گڑھ کے فارغ التحصیل طلبہ کے لیے خصوصی نصاب کا بندوبست کیا اور دارالعلوم کے فارغین کی علی گڑھ جانے اور جدید علوم سیکھنے میں ان کی ہمت افزائی کی۔ مدرسہ نظارۃ المعارف القرآنیہ دہلی قایم ہوا تو اس کے سرپرستوں میں حکیم اجمل خان مرحوم کے ساتھ نواب وقار الملک کو برابر کا شریک بنایا۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں بیماری کی انتہائی شدت کے باوجود حضرت شیخ الہند نے علی گڑھ کا سفر کیا۔ اپنے وصال سے چند دن قبل جامعہ ملیہ، دہلی کا سنگ بنیاد رکھا اور زندگی کے آخری لمحوں تک وہ اس کوشش میں مصروف رہے کہ علی گڑھ کے قلب کی سیاہی ایمان کی روشنی میں بدل جائے، لیکن ان مخلصانہ مساعی کے صلے اور جواب میں علی گڑھ کے فرزندوں نے حضرت شیخ الہندؒ، آپ کے ساتھیوں، شاگردوں، جاں نثاروں، مولانا سندھی وغیرہ کی جاسوسی کی ان کے لیے مشکلات پیدا کیں، قید وبند کے دروازے کھولے، گورنمنٹ میں عہدے اور منصب اور سرٹیفکیٹ حاصل کیے اور اس طرح دارالعلوم کے اکابر اور مخلصین ملت کی ایک ایک سعی کو ناکام بنادینے کی کوشش کی۔ حتی کہ ان بزرگوں کی توہین وتضحیک اور انھیں رسوا و بدنام کرنے کے لیے افترا و بہتان اور

ان کی جان تک لینے کی کوشش سے دریغ نہ کیا۔ دیوبند اور علی گڑھ کی یہ کشمکش تھی جس نے بعد میں مسلم لیگ اور جمعیت علماے ہند کی چپقلش کی صورت اختیار کی۔ انتہائی تلخ تجربات کے باوجود اس دور میں بھی علماے دیوبند مسلمانوں کے اتحاد واتفاق اور قدیم وجدید کی ہم آہنگی سے مایوس نہیں ہوئے لیکن مسلم لیگ کے اکابر نے جو رویہ اختیار کیا، اس کی دردناک روداد مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ نے اپنے ایک انٹرویو میں بیان کردی ہے۔ یہ انٹرویو خواجہ عبدالوحید مرحوم نے لیا تھا اور علامہ عثمانی کی زندگی ہی میں لاہور کے اخبار سہ روزہ زمزم میں چھپوا دیا تھا۔ اس کے باوجود کہ علی گڑھ دیوبند کو کبھی گوارا نہیں کرسکا لیکن ملت کی غمگساری اور اسلامی اخلاق وسیرت اور اخلاص وعمل میں دیوبند سے متاثر ہوئے بغیر بھی نہ رہا۔

علی گڑھ کے جامد اور انگریز پرست ماحول سے جو چند آزادی کے متوالے اور ملت کے بہی خواہ نکلے، جنھوں نے علی گڑھ کی پیشانی سے کلنگ کا ٹیکا مٹانے کی کوشش کی اور اگرچہ وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے، لیکن وہ اپنے اخلاص اور بہی خواہی ملت کا نقش ضرور لوگوں کی دلوں پر ثبت کرگئے۔ ان میں مولانا محمد علی، شوکت علی، تصدق احمد خاں شیروانی، حسرت موہانی، مولانا ظفر علی خاں، مہدی افادی، مولانا حمید الدین فراہی، اقبال سہیل، عبدالمجید خواجہ، طفیل احمد منگلوری، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر ذاکر حسین، شیخ عبداللہ (کشمیری) اور چند ایسے ہی اور حضرات ہیں۔ یہ تمام اصحاب کسی نہ کسی درجے میں حضرت شیخ الہند رحمہ سے متاثر اور آپ کے نقش سیرت کے گرویدہ تھے اور اسی تاثر اور گرویدگی کے نتیجے میں قومی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد ٹھہرایا تھا۔ علی گڑھ میں سرسید رحمہ کی گدایانہ پالیسی کے خلاف جو احساس اور جذبہ پیدا ہوا، اس میں سب سے نمایاں اثر دیوبند کا تھا حالِ آں کہ دیوبند کے اکابر نے علی گڑھ کے خلاف نہ تو کبھی پرجوش تقریریں کی تھیں، نہ لوگوں کے جذبات کو بھڑکایا تھا اور نہ محمد علی کی طرح اس کی اینٹ سے اینٹ بجادینے کی دھمکی دی تھی۔ لیکن دیوبند کی ایک سیرت تھی جس نے علی گڑھ کی آنکھوں کو خیرہ کردیا تھا۔ یہ سیرت اپنا کام کررہی تھی اور اس کے اثرات رفتہ رفتہ پھیل

رہے تھے۔

علی گڑھ کے علاوہ ملک میں دوسرے سیاسی و دینی ادارے اور ثقافتی وتہذیبی حلقے بھی دیوبند سے متاثر ہوئے۔ نواب وقار الملک ظاہر ہے کہ علی گڑھ کی پیداوار نہ تھے۔ حکیم اجمل خاں ایک دوسرے دایرے سے تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری (مختار احمد) کا میدان دوسرا تھا، وہ ایک مختلف فن کے شخص تھے۔ علامہ اقبال کی ابتدائی تعلیم وتربیت کے سانچے دوسری مٹی سے تیار ہوئے تھے۔ بعد میں بھی ان کی شخصیت اور فکر کے نشو ونما کی دنیا دوسری تھی۔ وہ اپنے ہی عالم افکار کے بلند پرواز شاہین تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا ابتدائی ماحول دوسرا تھا، ان کے والد ایک دوسرے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ حالی وشبلی اپنی الگ الگ دنیائیں رکھتے تھے۔ اکبر الہ آبادی کا اپنا الگ مزاج تھا لیکن حضرت شیخ الہند رہ کی شخصیت اور دارالعلوم دیوبند کے کردار سے سب متاثر تھے۔ ان میں ایسی کشش تھی کہ جو ایک نظر ان پر ڈالتا تھا، انھی کا ہو رہتا تھا۔

دیوبند کے اثرات ملک کے اداروں اور شخصیات ہی پر نہیں، بیرون ملک کی اکابر شخصیات پر بھی پڑے اور ادارے بھی ان سے متاثر ہوئے۔ سفرنامہ اسیر مالٹا، نقش حیات، تحریک شیخ الہند رہ، ریشمی رومال تحریک، مولانا عبید اللہ سندھی کی تحریرات، اقبال شیدائی کی سرگزشت، ظفر حسن کی آپ بیتی وغیرہ کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی ملی وسیاسی تحریک سے افغانستان، ترکی اور حجاز کی متعدد اہم شخصیات متاثر تھیں۔

دارالعلوم دیوبند کے اثرات بعض مستقل علمی خانوادوں پر بھی پڑے اس سلسلے میں پنجاب کے غزنوی خاندان اور یوپی کے بعض اہل حدیث علماء کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ علمائے اہل حدیث خصوصاً غزنوی خاندان اپنی ایک مستقل علمی اور تعلیمی تہذیبی روایت رکھتا ہے۔ اس کی فکر وخدمات کا پیمانہ بہت بلند ہے۔ وہ دین اور ملت کی خدمت گذاری کی عظیم الشان تاریخ میں اپنا امتیاز رکھتا ہے۔ اسی طرح لدھیانہ کا خانوادہ علمی جس کے آخری دور کے ورثائے علم وعمل میں مفتی محمد نعیم اور مولانا حبیب الرحمن کے سے اصحاب عزیمت دعوت گزرے ہیں۔ دایرہ شاہ اجمل (الہ آباد)، فرنگی محل (لکھنؤ) اور

بدایوں، رام پور، اجمیر وغیرہ کے خانوادہ ہائے علم وتصوف اور تعلیم وتدریس کے دور آخر کے اکابر کے حالات ہمارے سامنے ہیں، تمام حضرات حضرت شیخ الہند رہ کی فکر کی تابانیوں سے متاثر اور حضرت کی شخصیت کی عظمت واجلال کے معترف تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اپنی ذات سے ایک انجمن اور ایک مستقل حیثیت کے مالک تھے وہ اپنی زندگی اور افکار کی تعمیر میں اپنے والد کی فکری وعلمی شخصیت کے بھی رہین منت نہیں تھے۔ بلاشبہ انھوں نے اپنے والد کی سیرت کے کچھ اجلے نقوش کو اپنا لیا تھا، لیکن دارالعلوم دیوبند کی خدمات اور حضرت شیخ الہند کی سیرت کی جلوہ سامانیوں نے انھیں بھی اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔

بیسویں صدی کی ایک بڑی علمی شخصیت علامہ سید سلیمان ندوی کی تھی۔ انھیں ندوۃ العلماء کا فرزند عظیم کہنا چاہیے، لیکن دارالعلوم دیوبند کے دایرہ اثر سے وہ بھی باہر نہ رہے۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی رہ سے سلسلہ بیعت میں منسلک اور مجاز بیعت وارشاد تھے۔ یہ حضرت تھانوی رہ کا فیضان نظر تھا یا مکتب دیوبند کی کرامت کہ اس تعلق بیعت کے بعد ان کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا ہوا۔ معراج روحانی کے اثبات میں ان کی پاس عقل ومنطق کے استدلات کی کمی، نہ تھی وہ روایات کا سہارا لے سکتے تھے، بعض صحابہ رہ اور علما وحکما کے اختلافات سے اپنے مقدمے کو مستحکم کر سکتے تھے۔ لیکن ان کی روح سعید وقلب سلیم نے ان بنیادوں پر افکار کی تعمیر گوارانہ کی اور اسی مسلک کو اختیار کیا، جس کی طرف حضرت تھانوی کے فکر نے رہنمائی کی تھی اور علمائے دیوبند کا مسلک تھا۔

اسی سلسلے میں مولانا عبد الباری ندوی اور مولانا عبد الماجد دریابادی کا نام بھی آتا ہے۔ ان کی عقیدتوں اور ارادتوں کے رشتے اکابر دیوبند سے ہمیشہ استوار رہے۔ موجودہ شخصیتوں میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی نامور شخصیت ہے۔ ان کا تعلق رائے بریلی کے ایک تاریخی خانوادہ علم وعرفان سے ہے۔ وہ خود دعوت وارشاد کے سلسلے کی ایک اہم شخصیت ہیں۔ ان کے خاندان میں علم ودین، سیرت واخلاق اور عرفان وتصوف کا کون سا سرمایہ نہ تھا، جس کے لیے وہ دوسروں کے محتاج ہوتے لیکن علما دیوبند سے ان کی عقیدت

وارادت معلوم ہے اور علوم قرآنی میں اسی مدرسہ فکر کے ایک عالم ربانی شیخ تفسیر مولانا احمد علی لاہوری کی تعلیم و تربیت اور سیرت کی جھلک آں محترم کی فکر وسیرت میں دیکھی جاسکتی ہے۔

علمی خدمات:

علمی خدمات کے میدان میں بھی دیوبند اور اس کے فرزندوں نے صرف کام نہیں کیا، کارنامے انجام دیے ہیں۔ یہ علمی خدمات شخصی طور پر بھی انجام دی گئی ہیں اور منظم علمی اداروں کی صورت میں بھی۔ دارالعلوم دیوبند نے بلند پایہ اہل قلم مصنف، شاعر، صحافی اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین پیدا کیے۔

مفسرین ومترجمین قرآن کے سلسلے میں سب سے پہلا نام حضرت شیخ الہند رح کا آتا ہے۔ آپ کے شاگردوں میں کئی حضرات ایسے گزرے ہیں، جن کا شمار بلند پایہ مفسرین میں ہوتا ہے۔ ان میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا اشرف علی تھانوی، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ تھانوی سلسلے کے بزرگ مفتی محمد شفیع دیوبندی نے معارف القرآن کے نام سے اور بعض دوسرے بزرگوں نے تفسیری لٹریچر میں کتنے ہی دفاتر کا گراں قدر اضافہ کیا ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کا شمار بھی اسی خانقاہ علم وتصوف کے مفسرین میں کیا جانا چاہیے، لیکن ان کا اپنا انداز تفسیر ہے۔

مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی ایک جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے انھوں نے دعوت قرآن وتفسیر کا ایک خاص میدان اور اسلوب اختیار کیا اور قصص القرآن کے نام سے اپنی یادگار چھوڑ گئے۔ اسی مجوزہ اسلوب کو مخدومی مطاعی حضرت مولانا شریف احمد صاحب مدظلہ العالی نے دعوت قرآنی کی عمومی اشاعت کے لیے اختیار فرمایا ہے۔ تذکرۃ الانبیاء اور خاتم الانبیاء (دو حصے) حضرت کی تالیف لطیف ہے۔

حضرت لاہوری کے بعد ان کے خلیفہ ارشد مولانا قاضی زاہد الحسینی رح نے اپنے دروس قرآن کے ذریعے دعوت رجوع الی القرآن کو پاکستان کے شمال مغربی علاقے کے امصار وقریات تک عام کرنے میں سعی بلیغ کی

اور اس میں وہ بہت کامیاب رہے۔ موجودہ دور کے بزرگوں میں حضرت صوفی مولانا عبدالحمید سواتی صاحب دامت فیوضہم کی خدمت دروس واشاعت تفسیر کی عظمت ووسعت اور اس کے فیضان واثرات کا تقاضا ہے کہ اس پر تحقیق وتعارف کی خاص نظر ڈالی جائے۔ حضرت صوفی صاحب نے خانواہ ولی اللہ دہلوی اور دیوبند کے اکابر علم وتفسیر کے بہترین خصائص کو اپنے دروس تفسیر میں جمع کر دیا ہے۔ حضرت کی ذات گرامی موجودہ دور میں ایک تفسیری مکتبہ فکر کے بانی کی سی ہے۔

یہ تمام مفسرین اپنی الگ الگ تفسیری خصوصیات کی بنا پر طبقہ مفسرین میں خاص امتیاز رکھتے ہیں۔ مولانا سندھی رہ اپنے خاص مجتہدانہ فکر وذوق اور انداز تفسیر کی بنا پر گویا مستقل تفسیری دبستان کے بانی ہوئے ہیں۔

عام اہل قلم میں مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی رہ، مولانا سعید احمد اکبر آبادی رہ، شیخ الاسلام حضرت مولانا حسین احمد مدنی رہ، حضرت مفتی اعظم مفتی کفایت اللہ، مولانا مناظر احسن گیلانی رہ مولانا ثناء اللہ امرتسری رہ، مولانا اشرف علی تھانوی رہ، مولانا سید محمد میاں دیوبندی، وغیرہ ایسے اصحاب علم واہل قلم ہیں جنھوں نے اپنے افکار اور تحقیقات سے اردو کے دینی وتاریخی اور سیاسی لٹریچر میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ صحافیوں میں مولانا شائق احمد عثمانی (ایڈیٹر عصر جدید، کلکتہ) اور مولانا محمد عثمان فارقلیط (ایڈیٹر **الجمعیت**، دہلی) اور شاعروں کی صف میں مولانا تاجور نجیب آبادی کے سے نامور صحافی اور شاعر گزرے ہیں۔ مصلحین امت میں مولانا احمد علی لاہوری رہ، اور مولانا اشرف علی تھانوی رہ محققین ومفکرین اور محافظین ناموس رسالت میں مولانا انور شاہ کاشمیری رہ کی سی نابغہ روزگار شخصیات گزری ہیں۔ مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی مرحومین نامور خطیب ہوئے ہیں قاری محمد طیب صاحب رہ کا شمار بھی پاک وہند کے بلند پایہ خطیبوں میں ہوتا ہے۔

علمی ومجلّاتی صحافت کے میدان میں تو دیوبند کی خدمات کا پیمانہ بہت ہی بلند رہا ہے۔ الرشید، القاسم، دارالعلوم وغیرہ رسائل تو دیوبند سے جاری ہوئے اس کے فرزندوں نے ملک کے طول وعرض میں اردو، عربی وغیرہ کے جو

رسائل نکالے ان کی فہرست مرتب کرنے کی طرف ابھی شاید کسی نے توجہ نہیں کی۔ دیوبند کی خدمات کا یہ ایک اہم پہلو ہے۔ رسائل و جراید کے ذریعے وقت کے اہم دینی، معاشی، سیاسی مسائل پر نہایت بلند پایہ لٹریچر فراہم ہوا۔ بلند پایہ علمی، تاریخی اور تحقیقی مقالات لکھے گئے، تہذیب وثقافت اور دور جدید کے بے شمار مسائل پر فکر انگیز مضامین کا ذخیرہ فراہم ہوا۔

آج بھی ہندوستان پاکستان میں اگر بلند ترین علمی و تحقیقی اور دینی مجلّات کی ایک مختصر فہرست تیار کی جائے تو برہان، دہلی، الحق، اکوڑہ خٹک اور بینات و البلاغ، کراچی، الرشید اور انوار مدینہ، لاہور، الفاروق جو اردو، عربی، انگریزی، سندھی چار زبانوں میں کراچی سے شائع ہوتا ہے اور نصرۃ العلوم، گوجرانوالہ کے نام سرفہرست ہوں گے۔

علمی و تحقیقی اداروں کا قیام:

دارالعلوم دیوبند میں اور اس کے باہر اس کے فرزندوں نے حالات و وقت کے مطابق بلند پایہ علمی و تحقیقی ادارے بھی قائم کیے اور اب تو تقریباً تمام دینی مدارس میں تحقیق اور تصنیف وتالیف کے مستقل شعبے قایم ہو چکے ہیں۔ دارالعلوم دیوبند کی بیشمار اور اہم خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے فارغ التحصیل ایسی ذہنی وفکری تربیت سے آراستہ ہوتے ہیں جو کسی راہ میں صرف مقلدانہ گام فرسائی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ حالات ووقت کے مطابق اپنی راہ آپ پیدا کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وقت کا جوں جوں تقاضا ہوا علمی ادارے بھی قایم ہوتے گئے اور رسایل و جراید کا اجرا بھی عمل میں آتا گیا۔ اس کے فرزندوں نے علم وعمل کے مختلف میدانوں میں خدمت ملت کی راہیں خود تلاش کیں دارالعلوم کے اندر تصنیف وتالیف کے انفرادی مشاغل کے علاوہ کئی اکیڈمیاں قایم ہیں۔ ان میں سے "مجلس معارف القرآن" ہے، شیخ الہند اکیڈمی ہے۔ دارالعلوم سے باہر ندوۃ المصنفین (دہلی) دارالعلوم کے فرزندوں کا کارنامہ ہے، مجلس علمی (ڈابھیل حال کراچی) اسی سلسلے کے تحقیق اور تصنیف وتالیف کا ذوق رکھنے والوں نے قایم کی، انجمن خدام الدین، لاہور ہے بیت الحکمت کے نام سے مولانا عبید اللہ سندھی نے ایک ادارہ قائم کیا تھا

جس کا مرکز دہلی اور اس کی شاخیں کراچی، پیرجھنڈا، خان پور، لاہور میں قائم کیں۔ ان کے تحت بعض اہم تصانیف شائع ہوئیں۔ کراچی میں مجلس یادگار شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں سرگرم عمل ہے۔ مولانا قاری شریف احمد صاحب اس کے صدر رہیں۔

ان کے علاوہ تبلیغی واشاعتی ادارے ہیں جن کی تعداد سیکڑوں سے متجاوز ہے۔ حضرت مولانا سید محمد میاں رحمہ اللہ اپنی ذات سے ایک اکیڈمی تھے انھوں نے گوناگوں تصنیف تالیف کا جو کام کیا کہ وہ کئی اداروں پر بھاری تھا۔ اگر آپ چاہیں اور نہ چاہیں جب بھی ان کے بجائے جمعیت علماہند کا نام لے لیجیے کہ اس کے شعبہ تصنیف وتالیف کی سب سے بڑی شخصیت کا نام "سید محمد میاں" تھا۔ انھوں نے نہ صرف نظری اور عملی سیاسی موضوعات پر لکھا بلکہ سیرت، تعلیم، فقہ، افتا اور زبان کے مسائل وموضوعات سے لے کر افسانوی ادب کی تخلیق تک کی۔ نہ ان کا قلم کوتاہ تھا اور نہ ان کے موضوعات کا دائرہ تنگ تھا۔ بحیثیت مجموعی علوم ومعارف دینی کی تالیف وتدوین میں دارالعلوم کے فرزندوں کو خاص امتیاز حاصل ہی تھا۔ دیگر علوم وفنون کے مختلف میدانوں میں بھی انھوں نے نمایاں مقام حاصل کیا۔ قرآن کے متعلق مختلف علوم میں، حدیث کے مختلف میدانوں میں، فقہ میں، علوم نقلیہ وغیرہ علوم دینی میں مقلدانہ اور نقل واقتباس کی خصوصیات ہی کی بنا پر نہیں بلکہ مجتہدانہ نظر وبصیرت کی بنا پر بھی ان کے امتیاز واختصاص کو دینی وعلمی حلقوں میں تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ امتیاز دیوبند کی تاریخ ماضی ہی کا حصہ نہیں بلکہ آج تک اس کا یہ امتیاز قائم ہے۔

سیاسی خدمات:

اکابر دارالعلوم نے ہمیشہ اور ہر دور میں مسلمانوں کی فلاح وبہبود، ملت کے قیام، ملک کی آزادی اور ترقی کی ہر تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور خواہ مسلمانوں کے مصالح ہوں یا تمام برادران وطن کے مشترکہ مفاد کی جدوجہد ہو، انھوں نے کبھی ملت کی بہی خواہی اور خدمت خلق کے کاموں میں اپنے آپ کو کسی سے پیچھے نہیں رکھا۔ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں وہ کسی دوسری جماعت کے نہ مقلد تھے نہ پیرو۔ تحریک اصلاح وجہاد کے نام سے ان کے بزرگوں نے

قیام ملت اور ملک اور تمام برادران وطن کی آزادی اور فلاح وبہبود کا جو نصب العین اپنے سامنے رکھا تھا وہ اسی کی طرف بڑھتے رہے تھے۔ اس میں اپنوں اور بیگانوں سے اختلاف واتحاد کے مرحلے پیش آتے رہے، لیکن انھوں نے نہ کسی پر بھروسا کیا نہ کسی کا انتظار۔ وہ تمام باتوں سے بے نیاز آگے بڑھتے رہے۔

وطنی اور غیر ملکی تحریکات:

دارالعلوم کے بزرگ فکر وعقیدہ اور علم وتہذیب کی روایات میں جن اسلاف کرام سے نسبت رکھتے تھے اور پھر انھوں نے اپنی تعلیم وتربیت سے جو اصحاب استعداد اپنی روایات کے امین چھوڑے تھے، انھوں نے ایسا قلب گداز اور دل دردمند پایا تھا کہ ان کے وطن میں یا بیرون وطن، دنیا کے دور یا نزدیک کسی ملک میں کسی کا استحصال ہو، کسی کے حقوق غصب کیے جائیں یا کسی کی آزادی چھینی جائے۔ غرضے کہ اپنی یا کسی غیر قوم کے گلے پر ظلم کا خنجر چلے، وہ تڑپ اٹھتے تھے۔ ان کی ملت پروری، وطن دوستی اور انسانیت نوازی کی داستانیں تاریخ میں رقم ہیں۔ اصحاب دارالعلوم کی خدمات کا دائرہ وطنی تحریکات سے لے کر غیر ملکی تحریکات تک پھیلا ہوا ہے۔

۱۔ وطن کی جنگ آزادی کے ابتدائی دور سے لے کر موجودہ زمانے تک جو ملی اور قومی تحریکیں چلیں، دارالعلوم کے اسلاف سے لے کر اخلاف تک سب نے ان میں حصہ لیا۔ تحریک اصلاح وجہاد (تا ۱۸۳۱ء)، جنگ آزادی (۱۸۵۷ء)، تحریک ریشمی رومال، (۱۹۱۷ء) تحریک ستیہ گرہ (۱۹۱۹ء) تحریکِ خلافت وترک موالات (۱۹۱۹-۲۴ء)، تحریکِ ہجرت (۱۹۲۰ء)، تحریکِ نمک سازی اور تحریکِ سول نافرمانی (۱۹۳۰ء وبعدہ)، انفرادی ستیہ گرہ (مقاومت) کی تحریک (۱۹۴۰-۴۱ء)، ہندوستان چھوڑدو تحریک (۱۹۴۲ء)، تحریک پاکستان (۱۹۴۰ء وبعدہ)، وغیرہ میں وقت کے ایثار اور جان ومال کی قربانی کی مثالیں قائم کیں۔

ملک کی آزادی کے بعد ہندوستان کے مسلمان سخت آزمایش سے

دوچار ہوئے۔ ان کی زندگی کا پورا نظام تہ وبالا ہو گیا تھا؛ ان کی معیشت تباہ ہوگئی تھی، انھیں سخت فرقہ وارانہ تعصب کا سامنا تھا۔ اغوا، قتل، لوٹ مار کا بازار گرم تھا، انھیں ہر طرف سے خطرات نے گھیر لیا تھا، لیکن دارالعلوم کے بزرگوں نے عوام، حکومت اور دستور کی مخالف اور دشمن قوتوں کا ہر سطح پر مقابلہ کیا اور مسلمانوں کی منجدھار میں پھنسی اور ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحل مراد تک پہنچادیا۔

جن مسائل میں مسلمان ہندوستان میں گرفتار ہوئے، اسی قسم کے مسائل پاکستان میں اقلیتوں کو درپیش تھے۔ دیوبند کے بزرگوں نے دونوں جگہ حالات کا مقابلہ کیا اور متاثرین کی بہترین امداد وحمایت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کے نظام، مقابر ومساجد اور دیگر مقدس مقامات وآثار کے تحفظ، اوقاف کے نظام وبقا کے لیے دستور سازی، متروکہ وغیر متروکہ املاک پر کسٹوڈین اور دوسرے ناجائز قابضین، پاکستان سے واپس جانے والوں کے مسائل کی پیچیدہ صورت حال، تہذیب و ثقافت کے تحفظ اور زبان کی بقا اور فروغ وغیرہ کے مسائل کا سامنا تھا۔ پاکستان میں فرقہ پرستی تنگ نظری، عداوت، دشمنی کے کم وبیش اسی قسم کے مسائل درپیش تھے، لوٹ مار کا بازار گرم تھا، اغوا، قتل کے واقعات نے زندگی کا سکون و اطمینان چھین لیا تھا۔ ان کے علاوہ جمہوریت کی بقا، دستور سازی، اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد تھی مسلمانوں کی اصلاح، اخلاق کی تہذیب، باطل فرقوں کی ریشہ دوانیاں، غیر اسلامی تحریکات کا ظہور، وغیرہ مسائل درپیش تھے۔ دارالعلوم دیوبند کے مکتب فکر کے علما وعوام نے ہر محاذ پر حالات کی اصلاح کے لیے سخت جنگ لڑی۔

۲۔ دیوبند کے اکابر نے دنیا کے دیگر ممالک کی آزادی، اس کے تحفظ اور ممالک کی بقا واستحکام کی تحریکات میں بھی حصہ لیا۔ افغانستان، ترکی، بلقان، حجاز، فلسطین، قبرص، مراکش، طرابلس، الجزائر، غرضے کہ ایشیا اور افریقہ ویورپ سے لے کر مشرق بعید کے ممالک تک کی آزادی کی جنگ میں اور وہاں کے عوام پر ظلم اور ان کے استحصال کے خلاف جب بھی کوئی تحریک اٹھی تو دیوبند کے

اکابر و اصاغر نے والے، درمے اور قدمے سخنے اس میں حصہ لیا اور ظلم واستحصال کے خلاف آواز اٹھانے اور مظلومین کی امداد وحمایت میں کوتاہی نہیں کی۔ اور حالات و وقت کے مطابق ان تمام تحریکات ومسائل میں دین کی تعلیمات حقہ کے مطابق مسلمانوں کی بہترین رہنمائی کا فریضہ انجام دیا۔

۱۳۲۷ھ (۱۹۰۹ء) میں جمعیت الانصار دیوبند اور ۱۹۱۹ء میں جمعیت علمائے ہند کے قیام سے علمائے دیوبند کی ایک جماعت نے ملک کی آزادی کی جدوجہد میں منظم طور پر حصہ لیا۔ اس نے آزادی کی راہ میں ہر طرح کی قربانیاں پیش کیں، قید بند کی سختیاں جھیلیں، مال ومتاع کا نقصان برداشت کیا اور تجارت وملازمت کے بہترین ذرائع معیشت کو اس راستے میں قربان کر دیا۔ اس جماعت کے ایک ایک فرد نے اتنی قید وبند کاٹی اور اتنا نقصان برداشت کیا کہ مسلم لیگ کے تمام رہنماؤں نے مجموعی طور پر بھی نہ اتنی قید کاٹی ہوگی، نہ اتنا نقصان اٹھایا ہوگا۔ صرف ایک شخص مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ نے تقریباً چوبیس سال جلا وطنی کی زندگی کے مصائب برداشت کیے۔ ایک مختصر مضمون میں پوری جماعت دیوبند کی جنگ آزادی میں قید وبند کی تفصیلات کی گنجایش تو نہیں مل سکتی، البتہ وقت کے عظیم مجاہد جماعت کے سربراہ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کو مثالاً پیش کیا جاسکتا ہے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے مالٹا میں تقریباً ساڑھے تین برس (دسمبر ۱۹۱۶ء تا جون ۱۹۲۰ء) مقدمہ بغاوت کراچی میں تقریباً دو برس (ستمبر ۱۹۲۱ء تا ستمبر ۱۹۲۳ء) سول نافرمانی کی تحریک کے زمانے میں تقریباً ڈیڑھ ہفتہ (۱۹۳۲ء) اور ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے زمانے میں تقریباً سوا دو برس (جون ۱۹۴۲ء تا اگست ۱۹۴۴ء) مجموعی طور پر تقریباً آٹھ برس قید کی زندگی گزادی تھی حضرت کے علاوہ مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا سید محمد میاں اور جمعیت علمائے ہند سے وابستہ سیکڑوں رہنماؤں اور ہزاروں کارکنوں نے اپنی زندگی کے کتنے برس قید کی کوٹھریوں میں گزارے تھے، حد شمار سے باہر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علمائے ہند اور دارالعلوم دیوبند کی کوئی ایسی تاریخ ابھی تک مرتب ہی نہیں ہوئی جس سے یہ معلوم ہوسکے کہ ان دونوں اداروں سے

وابستہ صوبوں کی سطح سے لے کر قصبوں اور قریوں تک کہاں کہاں کتنے لوگوں نے کن کن تحریکات میں کتنی سزائیں کاٹیں اور جان ومال کی کیا قربانیاں دیں اور تجارت، ملازمت وغیرہ ذرائع معیشت کی تباہی کی کن کن آزمایشوں سے گزرے تھے

دارالعلوم دیوبند نے اپنے وابستگان سے مجاہدین حریت کی ایک ایسی جماعت پیدا کردی جس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ اس جماعت میں حاجی امداداللہ مہاجر مکی ہیں، مولانا رشید احمد گنگوہی رح اور حجۃ الاسلام مولانا محمد قاسم نانوتوی رح ہیں۔ اسی جماعت میں حضرت شیخ الہند علیہ الرحمۃ کی ذات والاصفات نظر آتی ہے، شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی رح ہیں، جان نثار اسلام مولانا عزیر گل ہیں، امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی ہیں، فقیہ امت مفتی اعظم کفایت اللہ ہیں، مجاہد فی سبیل اللہ مولانا محمد میاں منصور انصاری ہیں، عازم حق مولانا محمد صادق (کراچی) وغیرہ بہت سے صاحب عزیمت ہیں۔

اس زنجیر کی آخری کڑیاں بھی ابتدائی کڑیوں سے کچھ کم اہم اور کم شاندار نہ تھیں۔ ان میں سے ایک کڑی مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمن سیوہاروی کی سیرت میں ڈھل کر ہمیشہ کے لیے تابندہ وزندہ جاوید ہوگئی تھی۔ حضرت سیوہاروی کی ذات ستودہ صفات بارش کا آخری قطرہ تھا، جو ملت کے نخل امید کو تروتازہ کرگیا۔ انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی جو خدمت کی اور ان کے حقوق ومفادات کے تحفظ کے لیے جو مجاہدانہ کردار ادا کیا، وہ ہمیشہ یادگار رہے گا۔ حضرت مولانا سید محمد میاں رح کا اصل میدان تصنیف وتالیف تھا، لیکن وہ عملی سیاست میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہے اور کئی بار قید وبند کی آزمایش سے گزرے۔ اگر ان بزرگوں کے بعد بھی ملت مسلمہ کا وجود باقی اور اس کی رہنمائی کی ضرورت موجود ہے۔ تو ہمیں یقین رکھنا چاہیے کہ دارالعلوم کے اخلاف میں بھی ایسی نابغہ اور صاحب عزیمت شخصیتیں ضرور پیدا ہوں گی جو ملت کی کشتی کو بھنور سے نکالیں گی اور اس کے مسافر ساحل مراد کو پالیں گے۔ موجودہ دور میں حضرت امیر الہند مولانا سید اسعد مدنی کی ذات گرامی تاریکیوں میں روشنی اور

مایوسیوں میں امید کی کرن موجود ہیں۔ ملت اسلامیہ ہندیہ کے نخل امید کی برومندی کی تمام آرزوئیں حضرت مدظلہ کے وجود سامی سے وابستہ ہیں۔ پچھلی ربع صدی کی تاریخ ہمارے سامنے ہے حضرت موصوف کی فراست وتدبر اور جرات مندانہ قیادت نے مسلمانوں کو بعض بڑے گھٹن مراحل اور مشکل حالات سے نکالا ہے اور نہ صرف ملت اسلامیہ کی رہنمائی بلکہ پوری ہندوستانی قوم کو اتحاد و ترقی اور عزت و وقار کی راہ دکھائی ہے۔

ادبی ولسانی خدمات:

اردو زبان کے باب میں بھی اکابر دیوبند کی خدمت کا پیمانہ نہایت بلند رہا ہے اردو کو آسان بنانے، بول چال کی زبان سے اسے ہم آہنگ کرنے اور ایک علمی زبان کا رتبہ دینے میں سرسید کی خدمات کا صور کچھ اس بلند آہنگی سے پھونکا گیا ہے کہ لوگ یہی سمجھ بیٹھے کہ اس تحریک کے قافلہ سالار سرسید ہیں۔ ان بے خبروں کو معلوم نہیں کہ تاریخ کی شہادت اس سے مختلف ہے۔ سرسید کی پیدائش کا سال ۱۸۱۷ء ہے۔ حضرت شاہ رفیع الدین کا سال وفات بھی یہی ہے۔ شاہ عبد القادر کا انتقال اس سے تین سال قبل یعنی ۱۸۱۴ء میں ہوچکا تھا ان ہر دو ابنائے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی فرد خدمات میں ترجمہ قرآن بہت نمایاں ہے۔

شاہ رفیع الدین کے ترجمے کی اولیت اور حضرت شاہ عبد القادر کے ترجمے کی سلاست اور بامحاورہ وٹکسالی زبان میں ہونے کی شہادت سرسید نے خود دی ہے اور بابائے اردو مولوی عبد الحق تک اردو کے تمام مورخین اور تذکرہ نگاروں نے ان کے ترجمے کے ادبی ولسانی محاسن کا اعتراف کیا ہے۔ بلاشبہ یہ وہ حضرات تھے جن کی خدمات کو دار العلوم دیوبند کی خدمات کے زمرے میں محسوب نہیں کیا جاسکتا لیکن یہ وہ اسلاف تھے جن کی وراثت علمی و دینی کا سب سے زیادہ حصہ اصحاب دار العلوم ہی کے نصیب میں لکھا گیا تھا۔ ان اصحاب کے بعد مولانا عبد الحی اور شاہ اسمٰعیل شہید رہ کا دور آتا ہے یہ زمانہ سرسید کی خورد سالی کا تھا۔ ان حضرات کی خدمات کا غلغلہ بلند تھا اور دہلی کی

ٹکسالی اور بامحاورہ اردو میں ان کی عظیم الشان کتاب "تقویتہ الایمان" منصۂ شہود پر آچکی تھی۔ سرسید نے حضرت شاہ صاحب کی تقریروں کے مطالب سے اپنے دامن فکر کو بھرا تھا۔ بلاشبہ حضرت شاہ صاحب بھی بانیان دارالعلوم میں نہ تھے۔ لیکن اس براہیم وقت کی میراث فکر وسیرت تو اکابر دیوبند ہی کے حصے میں آئی، نہ کہ سرسید اس کے وارث ہوئے؟ لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی رح قطب وقت حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر رح اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رح تو دارالعلوم کے بانیوں میں سے تھے۔ یہ حضرات اس وقت بامحاورہ بول چال کی زبان اور آسان وعام فہم اردو میں اپنی متعدد کتب وتصانیف تالیف فرما چکے تھے، جب بانی علی گڑھ کالج سرسید احمد خاں صہبائی مرحوم سے مقفی ومسجع زبان لکھنے کی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ حضرت قاسم نانوتوی رح کی تالیف رسالہ حجۃ الاسلام، تقریر دل پذیر، مجموعہ رسائل قاسم العلوم وغیرہ، حضرت امداد اللہ کی تصانیف غذائے روح، ضیاء القلوب، تحفتہ العشاق، فیصلہ ہفت مسائل اور مولانا رشید احمد گنگوہی رح کی تصانیف کا تعلق خاص سرسید کے عہد سے تھا۔ یہ حضرات بانیان دارالعلوم تھے۔ ان تصانیف کے ادبی محاسن اور لسانی خصایص کی طرف کم توجہ کی گئی ہے، لیکن ان کا دایرہ اس سے بہت وسیع ہے، جو عام طور پر سمجھا جاتا ہے، ان کی ادبی اور لسانی خدمات کا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب سرسید کتم عدم سے وجود میں بھی نہ آئے تھے، ان کی خدمات کا یہ سلسلہ اس وقت بھی جاری تھا جب ان کے دودھ کے دانت بھی نہ اکھڑے تھے، وہ یہ خدمت اس وقت بھی اپنے قلم سے انجام دے رہے تھے جب سرسید اپنی تحریر وتالیف میں صہبائی کی نظر وکاوش کے رہین منت تھے اور یہ خدمت انھوں نے اس وقت بھی انجام دی جب سرسید "انگریزی حکومت کی برکتیں" اور برٹش حکومت کے قیام اور استحکام کے لیے "اپنی مدد آپ" قسم کے مضامین لکھ رہے تھے اور دیوبند کی یہ خدمت اس وقت بھی جاری رہی، جب اردو ادب کے عناصر خمسہ میں اختلال پیدا ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ منتشر ہو گئے سرسید اس جہاں سے رخصت

ہوگئے اور ان کا کوئی جانشین پیدا نہ ہوسکا' نذیر احمد' شبلی' محمد حسین آزاد دوسرے دایروں سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے سرسید کی تحریک کی طرف پلٹ کر نہ دیکھا۔ حالی بلاشبہ اپنی وفاداری میں استوار رہے 'لیکن ان کے جانشینوں نے ادب میں اپنی راہ آپ بنائی ہے ہر حال سرسید نے زبان و ادب کی جو عظیم الشان خدمات انجام دیں اس سے ہرگز انکار نہیں 'لیکن حقیقت یہی ہے کہ اولیت کا سہرا اس میدان میں بھی ارباب دیوبند اور ان کے بزرگوں ہی کے سر ہے۔

ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

فصل اول :

دار العلوم دیوبند کے قیام کا مقصدِ اولیٰ

دورِ قاسمی اور عہدِ محمودی پر ایک سرسری نظر

(۱)

دورِ قاسمی

تحریک ولی اللّٰہی کا نیا دور :

دار العلوم دیوبند کا قیام شاہ ولی اللہؒ دہلوی کی تحریک کے دورِ تجدید واحیاے ثانی کا آغاز تھا۔ ولی اللّٰہی تحریک ۱۔ تالیف و تدوینِ افکار، ۲۔ تعلیم و تربیتِ افراد، ترویج واشاعتِ مقاصد اور ۳۔ تنظیمِ جماعت اور سعیِ انقلابِ حالات کے تین اہم مراحل سے گزری تھی اور ۱۸۵۷ء میں مساعیِ انقلاب کی ناکامی کے بعد ضرورت پیدا ہو گئی تھی کہ

۱۔ کسی نئے مرکز کی تلاش کی جائے، جو دہلی کے مرکزِ انقلاب کے مقابلے میں محفوظ ہو، اس کے لیے دیوبند (ضلع سہارن پور) کے قصبے کا انتخاب کیا گیا۔

۲۔ نئے حالات میں افکار انقلاب کے تحفظ، تعلیم و تربیتِ اصحاب، ترویج واشاعت افکار اور تنظیم جماعت کا سر و سامان کیا جائے۔ انہی دو اہم مقاصد سے دار العلوم کا قیام عمل میں آیا تھا۔

دار العلوم دیوبند کے مربّی :

دار العلوم کے بانیوں میں متعدد حضرات شامل تھے، لیکن اس کے قیام کا جو جامع تصور تھا، وہ حضرت قاسم العلوم مولانا محمد قاسم نانوتوی کے سوا کسی کے

ذہن میں نہ تھا۔ دارالعلوم میں تعلیم و تربیتِ اصحاب استعداد، ترویج و اشاعت افکار اور تنظیمِ جماعت کے تمام کام دارالعلوم کے دو اکابر، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور مولانا محمود حسن دیوبندی کے عہد میں تقسیم ہیں۔ حضرت قاسم العلوم کا کارنامہ منصوبہ بندی، مرکزِ انقلاب کے قیام، اجتماع و اتحادِ قویٰ اور تعلیم و تربیت کے دائروں میں ہے اور حضرت شیخ الہند کا کارنامہ تعلیم و تربیتِ اصحابِ استعداد سے لے کر تنظیمِ قوائے ملت، اتحادِ اجزاے قوم اور افکار و اعمالِ انقلاب کے تمام جزئیات و کلیات تک وسیع ہے۔

دارالعلوم کے قیام کا مقصدِ اولیٰ :

دارالعلوم دیوبند کے قیام کا مقصد محض ایک دینی درس گاہ کا قیام نہ تھا۔ بلکہ وہ احیاے اسلام اور قیامِ ملت کی ایک ہمہ جہت تحریک تھی۔ اس میں دینی و اسلامی علوم و فنون کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مسلمانوں کی ذہنی، فکری اور عوائد و رسوم کی اصلاح اور دعوت و ارشاد بھی شامل تھی، تبلیغ و اشاعتِ اسلام بھی اس کی ایک جہت تھی۔ اسلامی زندگی کا قیام اور ملک و قوم کی آزادی بھی اس کے مقاصد کے دائرے میں آتی تھی۔

دیوبندی جماعت اور اس کا سلسلہ :

دارالعلوم نے جو جماعت تیار کی تھی، اس میں مختلف صلاحیتوں کے اصحاب شامل تھے اور اگرچہ بہ ظاہر الگ الگ اپنے کاموں میں مصروف تھے لیکن بہ باطن ان میں ایک رابطہ اور اتحادِ فکری موجود تھا۔ تمام قوائے جماعت تقسیمِ کار کے اصول پر کامل نظم و ضبط کے ساتھ مصروفِ عمل تھے۔

اس سے آگے بڑھ کر ملک کی دوسری مذہبی (سیاسی، جماعتوں اور مردانِ کار سے بھی تعلقات استوار کر لیے گئے تھے جو بنیادی طور پر دارالعلوم کے مذہبی) اور سیاسی مکتبۂ فکر سے تو تعلق نہ رکھتے تھے، لیکن ولی اللٰہی سلسلے کے بزرگوں سے

عقیدت وارادت یا دینی وملی یا سیاسی و قومی مقاصد میں اتحاد واتفاق کا کسی درجے میں بھی کوئی رشتہ ضرور رکھتے تھے۔ البتہ یہ کام بہت احتیاط اور رازداری کے ساتھ انجام پارہا تھا۔ حتیٰ کہ دارالعلوم کے لوگوں کو بھی جو سیاسی ذوق سے ناآشنا تھے، خبر نہ تھی۔

دارالعلوم دیوبند نے علوم اسلامیہ کی تعلیم و تدریس، دعوت وارشاد، اصلاحِ عوائد ورسوم، تصنیف و تالیف اور تدوین علوم و معارف کے میدانوں میں عظیم الشان خدمات انجام دی ہیں۔ اس کے علاوہ اس کی خدمات کا دائرہ ملک کی آزادی، برٹش استعمار سے عوام کی نجات اور برطانوی قوم کے استحصال سے قوم کو نجات دلانے کی کوششوں، قومی وسیاسی شعور کی تربیت، قوائے ملکی و قومی میں اتحاد، قوم و وطن کی تعمیر کے تمام کاموں، سماج اور سیاست کے تمام میدانوں اور عوام کی زندگی کے تمام گوشوں تک پھیلا ہوا ہے۔

ایک سوچا سمجھا منصوبہ:

دارالعلوم کے مردانِ کار نے سیاسی زندگی کے مقاصد اور ملک و قوم کی خدمت کے میدان کو محض اتفاق یا حادثے کی بنا پر اختیار نہیں کیا تھا۔ جیسا کہ ملک کے بعض دوسرے اداروں کے افراد حالات کے جبر یا کسی سیاسی تحریک یا شخصیت سے متاثر ہو کر سیاسی میدان میں آئے تھے۔ ملک کی سیاسی وسماجی خدمت اور قوم کو برٹش استعمار کے استحصال سے نجات دلانا اور قومی سیاسی نظام کا احیا دارالعلوم کے مقاصدِ قیام میں شامل تھا۔

دارالعلوم کے مقاصدِ قیام کا یہ پہلو اتنا واضح اور نمایاں ہے کہ اس پر کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں، لیکن اس موضوع کا تقاضا ہے کہ اسے خاص طور پر نمایاں کیا جائے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی دارالعلوم کے قیام کے پس منظر کے بارے میں لکھتے ہیں:

''جس وقت شاملی کے میدان سے وہ خود (حضرت قاسم نانوتوی) اور ان کے رفقاے کار بہ ظاہر ناکامی کے ساتھ واپس ہوئے، تو یقیناً ان کی یہ واپسی یاس اور نامرادی کی واپسی نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی...... واپس تو وہ بیشک ہوئے تھے، لیکن یقیناً یہ واپسی ''متحرّفاً لِقتال اَوْ متحیّزاً الیٰ فئۃٍ'' جنگ ہی کے لیے کتراتے ہوئے یا کسی ٹولی سے ملنے کے لیے ہو سکتی تھی اور یقیناً اسی کے لیے تھی''۔ (سوانح قاسمی: ج ۲، ص ۲۲۳۔ ۲۲۲)

نئے محاذِ جنگ کی تیاری:

آگے چل کر دارالعلوم کے قیام کو ''قتال کے نئے محاذ اور میدان کی تیاری'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ مولانا لکھتے ہیں:

''۱۸۵۷ء کی کشمکش کی ناکامی کے بعد قتال اور آویزش کے نئے محاذوں اور میدانوں کی تیاری میں آپ (حضرت نانوتوی) کا دماغ مصروف ہو گیا۔ دارالعلوم دیوبند کا تعلیمی نظام، اس لائحۂ عمل کا سب سے زیادہ نمایاں اور مرکزی و جوہری عنصر تھا۔'' (ایضاً، ص ۲۲۴)

مولانا سید محمد میاں مرحوم نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی سے دارالعلوم کے قیام کے بعد جب اسی جماعت کے ایک بزرگ حاجی رفیع الدین نے (جو دارالعلوم کے دوسرے مہتمم حضرت شاہ عبدالغنی کے خلفاء میں سے تھے) عرض کیا:

''ہم نے دیوبند میں ایک مدرسہ قائم کیا ہے۔ اس کے لیے دعا فرمائی جائے: تو آپ نے فرمایا:

''سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں، ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے! یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقاتِ سحر میں سربہ سجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوندا! ہندوستان میں بقاے اسلام اور تحفظِ علمِ دین کا کوئی ذریعہ پیدا کر۔'' (علماے حق اور اُن کے

مجاہدانہ کارنامے: حصہ اوّل، ص ۷۱)

مولانا گیلانی نے اس پر لکھا ہے کہ:

"اس کا مطلب بجز اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ شاملی کے میدان سے واپسی کے بعد سوچنے والوں نے نہ تو مایوس ہو کر سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا اور نہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ بیٹھ گئے تھے۔ "بقائے اسلام اور تحفظ علم دین" کے نصب العین کو آگے بڑھانے کے لیے دماغ بھی مصروفِ فکر تھے اور ان کے قلوب بھی کائنات کی مرکزی قوت سے لو لگائے "غیبی لطیفہ" کے ظہور کا انتظار کر رہے تھے۔"
(سوانح قاسمی: ج۲، ص ۲۲۴)

اس "نئے محاذ" کے قیام کی حکایت میں مولانا گیلانی مرحوم کے لیے نہ جانے کتنی لذت تھی کہ وہ "سوانح قاسمی" کی بڑی تقطیع کے صفحات میں صفحہ ۲۲۲ سے لے کر صفحہ ۲۲۵، بلکہ اس کے بعد تک اُسے دراز کرتے چلے گئے ہیں۔ اس بیان کے چیدہ چیدہ جملوں کو یہاں نقل کیا جاتا ہے تاکہ دارالعلوم کے مقاصدِ قیام کا یہ پہلو قارئینِ کرام کے ذہن میں خاص طور پر نمایاں ہو جائے کہ دارالعلوم کا قیام محض ایک درس گاہ کے قیام کا واقعہ نہ تھا، بلکہ ملک کی آزادی اور قیامِ ملتِ اسلامیۂ ہند کی تاریخ کے ایک نئے دور کے آغاز کا عظیم الشان واقعہ تھا۔ مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

(۱) "الغرض واپس ہونے والا جب واپس ہوا تھا، تو کسی "نئے محاذ" ہی کے قائم کرنے اور اس "فئتہ" یا جماعت سے رشتۂ اتصال و رابطہ کو درست کرنے ہی کے لیے واپس ہوا تھا، جس کے اجتماعی شیرازے کو درہم برہم کر کے چاہا جارہا تھا کہ ہمیشہ کے لیے نیست و نابود کر دیا جائے۔" (ایضاً: ص ۲۲۵)

(۲) "واقعہ یہی ہے کہ دیکھنے والوں نے ۵۷ء کے ہنگامۂ رست و خیز کے دھیمے پڑ جانے کے بعد اُس (حضرت نانوتوی) کو جو کچھ کرتے ہوئے دیکھا، بہ ذاتِ خود

اُس کے لیے اور واپس ہونے والے ساتھیوں کے لیے یہ سب کچھ دیکھا بھالا تھا۔ ایک طے شدہ "لائحۂ عمل" تھا۔ اپنے وقت پر اس کے فیصلے عملی قالب اختیار کرتے چلے جاتے تھے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ مصلحتِ الٰہیہ اور "اجلِ مسمّیٰ" کا اٹل قانون ہندی مسلمانوں کے اندر اس کے قیام کی مدت کو اگر حد سے زیادہ مختصر نہ کر دیتا، تو دیکھنے والوں کو خدا ہی جانتا ہے، وہ کیا کیا کر کے دکھاتا"۔

(ایضاً: ص ۲۶۔ ۲۲۵)

(۳) "مدرسے کے اجرائے قیام کی حد تک وہ (مولانا قاسم نانوتوی) اپنے اور اپنے رفقائے کار کے اسی طے شدہ "لائحۂ عمل" کے ساتھ "نئے محاذ" کے کھولنے کے لیے صرف صالح اور قابل ذہن کی تلاش میں سرگرداں تھا۔ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام جس میں عصری اقتضاؤں کی تکمیل کا بھی سروسامان تھا، اُس کے اِس لائحۂ عمل کا اہم ترین جزء بلکہ قالب کے لحاظ سے، سب کچھ وہی تھا کہ نئے محاذ کا یہ نیا قالب یا "عملی مرقع" کہاں قائم ہو"۔ (ایضاً: ص ۲۹۔ ۲۲۸)

(۴) "اسی نئے محاذ کے بانی سیدنا الامام الکبیر (حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ) کے دیوبند والوں سے قرابتِ قریبہ کے موروثی تعلقات پشتہاپشت سے قائم تھے"۔ (ایضاً: ص ۲۳۰)

(۵) وہ "نیا محاذ" جسے سیدنا الامام الکبیر شاملی کے میدان سے واپس ہونے کے بعد کھولنا چاہتے تھے اس "نئے محاذ" اور اس کے دوررس مضمرات و مکنونات خواہ کچھ ہی ہوں، لیکن ظاہری قالب تو اس کا یہی تھا کہ مسلمانوں کی دینی زندگی کی حفاظت کے لیے دینی تعلیم کا ایک ایسا نظام قائم کیا جائے، جس کے ذریعے ملک کے طول و عرض میں جہاں تک ممکن ہو، بڑی سے بڑی تعداد دینی علوم کے علم برداروں کی پھیل جائے۔

اس جدید تعلیمی نظام کے متعلق عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے قدیم علما کی

تدریس و تعلیم کا آزاد اور انفرادی طریقہ سیدنا الامام الکبیر کے نزدیک قطعاً ناکافی تھا..... اپنے اسی اصولی نقطۂ نظر کے زیرِ اثر آپ دینی تعلیم کا اجتماعی نظام قائم کرنا چاہتے تھے۔ جس میں حتی الوسع تعلیم کے عصری لوازم اور تقاضوں کو بھی ممکنہ حد تک سمونے اور جذب کرنے کی صورت چاہا جاتا تھا کہ نکالی جائے''۔

(ایضاً : ص ۲۳۳)

۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی :

اور اب تو اس حقیقت کو شمس العلماء حافظ محمد احمد کے صاجزادۂ مرحوم نے بھی تسلیم کر لیا ہے کہ دارالعلوم کے مقاصد کا دائرہ درس و تدریس کے عام مقصد سے بلند بھی تھا اور بہت زیادہ وسیع بھی۔ حضرت مولانا قاری محمد طیب علیہ الرحمہ کا بیان کفایت کرتا ہے۔ اس پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں، لکھتے ہیں :

''عامۂ ان مؤسس اکابرِ مدرسہ کا تصور صرف تعلیم و تعلّم ہی کی حد تک تھا۔ حتی کہ عمارتِ مدرسہ کا سنگِ بنیاد رکھنے تک یہی رہا۔ جب کہ مدرسے کے اجراء پر آٹھ نو سال بھی گزر چکے تھے۔ یہ وسیع اور عالم گیر نصب العین ان کے سامنے نہ تھا جو حضرت قاسم العلوم اور ان کے رفقائے جہادِ شاملی بہ اشاراتِ غیب وبہ فیضانِ ولی اللہ و امداد اللہ اپنے اندر لیے ہوئے تھے اور جہادِ شاملی کے بعد یہ مقاصد اور بھی زیادہ قوت اور عزیمت کے ساتھ ابھر آئے جس کا سر چشمہ حضرت حاجی امداد اللہ اور سر خیل حضرت قاسم العلوم تھے۔

اس ولی اللٰہی اور امداد اللٰہی تصور میں اوپر تعلیم کا پردہ تھا اور نیچے اُسی تعلیمی لائن سے اعلائے کلمۃ اللہ، مسلمانوں کی آفاقی عزت و شوکت اور ملت کی عالم گیر خدمت کے اجتماعی جذبات پنہاں تھے۔ اسی حقیقت کو نمایاں کرتے ہوئے مولانا مناظر احسن گیلانی نے اپنے ایک مضمون ''دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن''

جو "دارالعلوم" (رسالہ) میں شائع شدہ ہے۔ حضرت شیخ الہند کا یہ مقولہ نقل کیا ہے:

"حضرت الاستاذ (حضرت مولانا نانوتوی) نے کیا اس مدرسے کو درس و تدریس تعلیم و تعلّم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے جس کے زیرِ اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے"۔ (نیز دیکھیے: سوانح قاسمی: ج ۲، ص ۲۲۶)

☆ چناں چہ حضرت نے احاطۂ مدرسہ میں طلبہ کو فنون سپہ گری سکھانے کا بندوبست بھی فرمایا تاکہ علم کے ساتھ سپاہیانہ اسپرٹ بھی ان میں قائم رہے۔

☆ محکمۂ قضا بھی قائم فرمایا تاکہ تنفیذِ احکام شرعیہ کی خُو بھی ان میں محفوظ رہے۔

☆ ترکوں کی امداد کے لیے بھی مساعی فرمائیں۔

☆ سلطان ترکی کی مدح میں قصائد بھی لکھے تاکہ خلافتِ اسلامیہ سے مدرسہ کے نونہالوں کا ربط قائم رہے۔

☆ انگریزی تسلط کے بعد ایسی اجتماعی انجمنوں کی حمایت و تائید بھی کی جو انگریزوں سے ملکی حقوق حاصل کرنے کے لیے قائم کی گئیں۔

☆ حضرت کی وفات کے بعد ان کے علمی جانشین شیخ الہند رحمہ اللہ نے ان ملّی مقاصد کو آگے بڑھایا اور

☆ پھر ان کے تلامذہ نے بھی تعلیمی لائنوں کو مضبوط کیا، مگر اجتماعی خدمات سے کبھی کنارہ کشی اختیار نہیں کی، بلکہ آزادی کی تمام تحریکات میں قائدانہ حصہ لیا۔ ان کے سرخیل اگر انگریزوں کے مقابلے میں میدان شاملی میں سربکف تھے تو ان کی ذریت اسی انگریز کے مقابلے میں قید و بند اور جیلوں میں سربکف رہی اور آج بھی کلمۂ حق کہنے میں آگے ہی آگے ہے"۔

(مقدمۂ تاریخِ دار العلوم دیوبند (اشاعت کراچی) ؍ص ۴۳ تا ۴۵)

حقیقت کا اعتراف :

یہ بیان شمس العلما حافظ محمد احمد علیہ الرحمہ کے صاحبزادۂ محترم قاری محمد طیب مرحوم کا ہے۔ اور اس بات کا کھلا اعتراف کہ ۱۹۱۳ء میں دار العلوم میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے اور حضرت شیخ الہند کے مقابلے میں شمس العلماء مرحوم نے جو رویہ اور برٹش استعمار پرستانہ جو پالیسی اختیار کی تھی، وہ ہر گز درست نہ تھی۔ مدرسے کے مقاصد قیام کے بارے میں حضرت شیخ الہند کا مسلک ہی درست تھا اور جس حقیقت کو ۱۹۱۳ء جھٹلایا گیا تھا اسے چونسٹھ برس کے بعد انھی مرحوم کے بیٹے نے تسلیم کر لیا۔ اگرچہ انھوں نے بھی اس دور کے نہایت اہم تاریخی واقعات کو اپنے مقدمہ میں نظر انداز کر دیا ہے۔ اپنی ''مختصر تاریخ دار العلوم'' میں ان واقعات کی پرچھائیں نہیں پڑنے دی اور سید محبوب رضوی کی جامع ''تاریخ دار العلوم'' میں بھی جمعیت الانصار کے قیام اور مولانا عبید اللہ سندھی کے تذکرے میں مصنف کو اسی اندازِ فکر کو اپنانے بلکہ انھی جملوں کو اختیار کرنے کی طرف رہنمائی کی جو خود انھوں نے اپنی مختصر تاریخ میں اختیار کیے تھے۔ لیکن تاریخ نے بالآخر اس حقیقت کو منوا ہی لیا۔ بھلا کہاں گورنر یوپی سر جیمس مسٹن کے حضور سپاس نامے میں یہ فرمانا کہ

> ''ہمارا ایک اور صرف ایک مقصد ہے! اور وہ ہے ''مذہبی آزادی کا تحفظ اور صرف مذہبی آزادی کا تحفظ!'' اس سے ہٹ کر کسی سیاسی تحریک کو مسترد کرنا یا قبول کرنا ہمارے قائم اور ناقابل تبدیلی نظریے کے باہر ہے۔
>
> اگر حکومت اسلام اور اس کے عقائد و رسوم کو اور ہمارے ''حقیقی لیڈر'' کو واقعی عزت دیتی ہے تو دل اور زبان سے اس کا شکریہ ادا نہ کرنا یا اپنے کسی عمل سے اس کے لیے مشکلات پیدا کرنا انتہائی ''ناشکری'' اور ''معصیت'' ہے''۔

اور کہاں شمس العلما کے صاحبزادۂ نامدار قاری محمد طیبؒ کا یہ اعتراف کہ

"حضرت شیخ الہند نے ملّی مقاصد کو آگے بڑھایا، پھر ان کے تلامذہ نے اجتماعی خدمات انجام دیں، آزادی کی تمام تحریکات میں حصہ لیا، انگریز کے مقابلے میں قید وبند کی زندگی کو اختیار کیا اور کلمۂ حق کہنے میں آگے رہے" وغیرہ وغیرہ۔

بلاشبہ دارالعلوم میں یہ کارنامہ انجام دیا گیا، مگر ان کے شاگرد اور جانشینِ علمی حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن، ان کے بعض تلامذہ مولانا عبیداللہ سندھی، شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی وغیرہم اور اُن کی ذرّیت نے خصوصاً ان کے بعد مولانا سید اسعد مدنی نے جو شمس العلماء اور ان کی "ذرّیت" کی آنکھوں میں خار بن کر کھٹکتے رہے۔

جب نئے محاذ کے قیام کا فیصلہ کیا جارہا تھا تو کئی مقامات کے نام ذہن میں آئے تھے لیکن یہ سعادت تو اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی دیوبند کی قسمت میں لکھ دی تھی۔ مولانا سید محمد میاں نے حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے یہ الفاظ نقل فرمائے ہیں:

"یہ دیوبند کی قسمت ہے کہ اس دولتِ گراں مایہ کو یہ سرزمین لے اڑی۔"

(علمائے حق اور اُن کے مجاہدانہ کارنامے: حصہ اول، ص ۷۱)

مدارس کا وسیع نظام اور اس کا مقصد:

دارالعلوم کے اعلیٰ دماغ اور بلند فکر بانی کو اس بات کا احساس بھی تھا کہ پورے ملک کی اجتمائی زندگی اور قیام ملت کی ضرورت کے لیے صرف دیوبند کا مرکزِ انقلاب اور محاذ ہی کافی نہیں ہو سکتا۔ ضرورت تھی کہ ملک کے مختلف علاقوں اور ان کے شہروں میں یہ محاذ قائم کیے جائیں جو اپنے اپنے دائروں میں خدمات انجام دیں۔ البتہ اُن کا فکری تعلق دیوبند کے مرکزِ انقلاب سے ضرور ہو۔ چناں چہ مولانا گیلانی مرحوم کے یہ قول:

"دیوبند میں اس نئے محاذ کی بنیاد ڈالنے کے بعد دیوبند کے علاوہ مراد آباد، نگینہ، تھانہ بھون وغیرہ میں اس کی شاخیں سیدنا الامام الکبیر ہی کے منشا کے مطابق کھلتی

چلی گئیں۔"

مراد آباد، امروہہ، نگینہ اور سہارن پور کے مراکز کا قیام تو دارالعلوم دیو بند کے قیام کے تھوڑے ہی عرصے بعد عمل میں آگیا تھا۔ اس کے بعد تو یہ تحریک ایسی پھیلی کہ ملک کا کوئی حصہ ایسا نہ تھا جہاں کوئی مدرسہ ہو اور اس کا تعلق دارالعلوم دیوبند سے نہ ہو یا کوئی مسجد ہو جس میں حضرت قاسم نانوتوی سے عقیدت رکھنے والا اور حضرت شیخ الہند سے نسبتِ ارادت یا رشتۂ تلمذ، رکھنے والا امام اور خطیب نہ ہو اور کوئی چھوٹا یا بڑا حلقۂ درس قائم نہ ہو۔ خاکسار نے ایک مضمون میں جو مکمل تاریخ دارالعلوم دیوبند (از سید محبوب رضوی) کی اشاعتِ کراچی میں شامل ہے، اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا ہے اور دیوبند کی سیاسی خدمات اور قومی و ملی زندگی، شخصیات اور تحریکات پر اس کے اثرات کا تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ اس لیے یہاں ان مطالب کے اعادے کی ضرورت نہیں۔

فصل دوم:

(۲)

دار العلوم دیوبند...... سیاسی سفر کا آغاز

عہدِ محمودی

حضرت شیخ الہند کے سامنے دار العلوم کے قیام کے علمی و تعلیمی اور اجتماعی و سیاسی دونوں پہلو تھے۔ حضرت کا تعلق دار العلوم کے عہد قیام سے بہت قریبی رہا تھا۔ ان کے والد مولانا ذوالفقار علیؒ دار العلوم کی تنظیم، تعمیر، ترقی کے تمام امور میں حضرت قاسم العلوم کے ساتھ شریک رہے تھے۔ حضرت شیخ الہند دار العلوم کے پہلے طالب علم تھے۔ گھر سے باہر تک ان کی تعلیم و تربیت کی نگرانی ولی اللہی جماعت کے ارکان نے کی تھی۔ وہ دار العلوم کے قیام کے مقاصد سے کسی کے بتانے سے پہلے واقف تھے۔ وہ اپنی اس واقفیت کے لیے کسی اخبار یا کتاب کے مطالعے کے محتاج نہیں تھے۔ ان کی واقفیت کسی پر اسپکٹس یا دستاویز کے مطالعے پر مبنی نہ تھی۔ بلکہ شاملی کے معرکے میں شریک ہونے والی جماعت کے پسپا ہونے اور قومی و ملّی مقاصد کے لیے جدوجہد کا نیا محاذ کھولنے والوں کی نجی محفلوں اور راز و نیاز کی گفتگوؤں پر مبنی تھی۔ حضرت شیخ الہند کی تعلیم و تربیت اسی ماحول میں ہوئی تھی اور دار العلوم کے بانیانِ کرام کی جماعت نے کی تھی۔ حضرت اس جماعت کے ارکانِ عظیم الشان کے شاگرد اور مرید تھے۔ اسی جماعت کے بزرگوں نے انھیں قرآن و حدیث کے درس دیے تھے، اسی جماعت نے انھیں شریعت و طریقت کے رموز سکھائے تھے، اسی جماعت نے انھیں قومی و ملّی سیاست کے بھیدوں سے آشنا کیا تھا۔ حضرت شیخ الہند کو بہ یک وقت حضرت مولانا رشید احمدؒ گنگوہی، حضرت حاجی امداد اللہؒ مہاجر مکی اور حضرت قاسم العلوم و الخیرات مولانا محمد قاسمؒ نانوتوی سے نسبتِ بیعت تھی اور خلعتِ خلافت حاصل

تھی۔ اور نہایت فخر کا مقام یہ تھا کہ وہ ان حضرات گرامی منزلت کے "مرید" ہی نہیں "مراد" تھے۔ حضرت قاسم العلوم نے ان کی تعلیم و تربیت میں خاص ہمت صرف فرمائی تھی۔ حضرت شیخ الہند حضرت قاسم العلوم والخیرات کے تربیت یافتہ تھے، انھیں حضرت کا اعتماد حاصل تھا۔ مولانا قاری طیب صاحبؒ نے بھی انھیں حضرت قاسم العلوم کا "جانشینِ علمی" تسلیم کیا ہے۔ وہ حضرت الاستاذ الکبیر کے مزاج شناس اور واقفِ اسرارِ نہاں تھے۔ دار العلوم کے بانیوں اور ابتدائی مخلصین و محسنین کے سلسلے میں جن بزرگوں کے نام آتے ہیں، حضرت شیخ الہند نے اُن کی آنکھیں دیکھی تھیں، ان سے علمی و روحانی استفادہ کیا تھا اور ان کی صحبتوں سے فائدہ اٹھایا تھا۔

عہدِ محمودی کے خصایص چہار گانہ :

دیوبند کی عظمت کی داستان حضرت شیخ الہند نے ہم دور افتادگانِ عہد کی طرح کتابوں میں نہیں پڑھی تھی۔ اُس کی عظمت کا نقش حضرت کی نگاہوں کے سامنے اجاگر ہوا تھا اور پھر آپ نے خود بھی اسے عظیم سے عظیم تر بنانے میں حصہ لیا تھا۔ پھر تاریخ نے وہ وقت بھی دیکھا کہ وہ حضرت قاسم العلوم کے علمی جانشین اور آپ کی جماعت کے رہنما بنے، دار العلوم میں انھیں مرکزیت اور مرجعیت کا مقام حاصل ہوا، دار العلوم کی صدارت اور اجتماعی زندگی میں ان حضرات کا بلند کیا ہوا علم آپ کے ہاتھوں میں آیا، جسے حضرت نے پوری قوت اور ہمت کے ساتھ پوری زندگی سربلند رکھا۔ حضرت شیخ الہند کے ان چہار گانہ خصایص اور خدمات کو تاریخ بھلا نہیں سکتی :

۱۔ حضرت کی ذاتِ گرامی اور خدماتِ دینیہ و اجتماعیہ سے دار العلوم کی تاریخ کا نیا دور شروع ہوتا ہے۔

۲۔ حضرت شیخ الہند نے حضرت مولانا محمد قاسم کی نہ صرف سیاسی تحریک کو آگے بڑھایا بلکہ آپ کی علمی و تعلیمی تحریک کو بھی وقار بخشا اور حضرت نانوتوی کے فیضانِ علمی اور منصوبۂ تعلیمی کو کہیں سے کہیں

پہنچادیا۔

۳۔ حضرت نے قاسمی جماعت کو منظّم کیا، اس پر عمل و انقلاب کا دروازہ کھولا اور اُسے ایک بین الاسلامی انقلابی تحریک بنادیا۔

۴۔ حضرت نے ہندوستان کے طول و عرض میں اس کے اثرات کو پھیلایا اور مسلمانوں کی اس ملی تحریک کو ہندوستان کی کل قومی انقلابی تحریک کا حصہ بنادیا۔

جمعیت الانصار کا قیام:

تعلیم و تربیت کے ایک زمانے تک تو یہ بات چھپی رہی لیکن ترویج واشاعت افکارِ سیاسی و اجتماعی اور تنظیمِ جماعت کے دور میں رفتہ رفتہ یہ بات ظاہر ہو گئی کہ تعلیم وتربیت اور ترویج واشاعتِ افکارِ سیاسی کا مرکز اور انقلاب کا سر چشمہ دارالعلوم اور تعلیم وتربیت سیاسی کے سب سے بڑے معلم اور مربی دارالعلوم کے صدر مدرس مولانا محمود حسن دیوبندی ہیں۔ ایک مدت تک ان کا یہ کام ایسی رازداری اور اتنی خوش اسلوبی سے چلتا رہا کہ خود دارالعلوم کے ارکان کو بھی اس کا پتانہ چل سکا۔ دارالعلوم کے بانیِ اعظم حضرت مولانا محمد قاسم کا یہ قول کہ ہم نے دارالعلوم کے اصل مقصد پر درس و تدریسِ علومِ اسلامی کا پردہ ڈال دیا ہے، ہر شخص کی زبان پر تھا لیکن وہ اصل مقصد کیا تھا اور کہاں اور کس طرح انجام پارہا تھا، کسی کو پتانہ تھا۔ حال آں کہ یہ کام اس حد تک انجام پا چکا تھا کہ متعدد اصحابِ استعداد کی سیاسی تربیت مکمل ہو چکی تھی، ملک کی سیاسی انقلابی شخصیتوں اور جماعتوں سے روابط اور ملک کے متعدد علمی، دینی اور انقلابی مراکز سے سیاسی تعلقات استوار ہو گئے تھے، دارالعلوم کے کئی فارغ التحصیل ملک کے مختلف علاقوں میں سیاسی کاموں میں مصروف تھے۔ یہ راز ۱۹۱۰ء میں، جمعیت الانصار کے قیام کے بعد رفتہ رفتہ کھلا اور جب راز کا انکشاف ہوا تو نہ صرف دنیا بلکہ دارالعلوم کے بعض حضرات بھی حیران و ششدر رہ گئے۔ حضرت مولانا شاہ عبد الرحیمؒ رائے پوری حضرت شیخ الہند اور دارالعلوم سے بہت قریبی تعلق رکھتے تھے

لیکن انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ حضرت اپنے مخصوص تلامذہ و مریدین سے بیعتِ جہاد بھی لیتے ہیں۔ جب معلوم ہوا تو انھیں اس بات پر بڑی حیرت ہوئی۔

جمعیت الانصار کے مقاصد :

۱۹۰۹ء میں حضرت شیخ الہند نے مولانا عبید اللہ سندھی کو دار العلوم بلایا اور جمعیت الانصار کے قیام اور اس کے تحت دار العلوم کے قدیم طلبہ کی تنظیم کا کام ان کے سپرد کیا۔ جمعیت الانصار کے اغراض و مقاصد اسی زمانے میں کتابچے کی شکل میں (ا) اور رسالے القاسم میں چھپ گئے تھے۔ "تذکرہ شیخ الہند" (از مفتی عزیز الرحمٰن) میں یہ تفصیل اور دیگر کتب میں بھی موجود ہیں، لیکن ہم یہاں "ریشمی خطوط سازش کیس" سے ان مقاصد پر روشنی ڈالتے ہیں :

"(جمعیت الانصار) مولوی عبید اللہ کی نظامت اور چھ سات ممبروں پر مشتمل مجلس منتظمہ کے ساتھ قائم ہوئی۔ یہ انجمن دیوبند میں تعلیم پائے ہوئے مولویوں کی انجمن کے طور پر قائم ہوئی ہے تاکہ

۱۔ مدرسۂ دیوبند کا انتظام کرے اور اس کو بہتر بنائے۔

۲۔ مدرسے کے لیے رقم کا انتظام کرے۔

۳۔ دیوبند میں جن عقائد کی تعلیم دی جاتی ہے، ان کی تبلیغ کرے اور انھیں فروغ دے اور

۴۔ دوسرے مقامات پر ایسے ہی مدرسے قائم کرے۔

۵۔ تمام مدارس اسلامیہ کو جمعیت الانصار کے تحت کر دیا جائے اور

۶۔ دیوبند کے فارغ التحصیل مولویوں کو ایسے تمام مدارس میں بھیجا جائے"۔

("تحریک شیخ الہند۔ ریشمی خطوط سازش کیس"، مرتبہ : مولانا سید محمد میاں (اشاعت کراچی) : ص ۳۵۔ ۴۳۴)

جمعیت الانصار کا قیام منتظمہ کی منظوری سے عمل میں آیا تھا، اسی نے اس کے قیام کے اغراض و مقاصد کی منظوری دی تھی، اسی کے فیصلے کے مطابق مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (نائب مہتمم دار العلوم) کو اس کا صدر بنایا گیا تھا، مولانا

عبید اللہ سندھی کو ناظم اور مولانا ابو احمد آف چکوال ضلع جہلم کو نائب ناظم مقرر کیا گیا تھا، لیکن اس کے بانی حضرت شیخ الہند تھے۔ مولانا سندھی حضرت کی ہدایت کے مطابق ہی کام کرتے تھے۔ حضرت شیخ الہند کا انھیں قرب اور اعتماد حاصل تھا۔

برٹش حکومت کی تشویش :

جمعیت الانصار کے مقاصد میں بہ ظاہر ایسی کوئی دفعہ شامل نہیں تھی، جس سے اس کے سیاسی عزائم و مقاصد کا اظہار ہوتا ہو۔ لیکن اس کے پہلے سالانہ اجلاس مراد آباد (۱۹۱۰ء) میں جو تجاویز پاس کی گئیں، اس سے اندازہ ہوا کہ جمعیت الانصار کالجوں کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشنوں سے قطعاً مختلف اور اس کا دائرۂ مقاصد ان سے بہت زیادہ وسیع اور عزائم کار ان کے کارکنان سے بہت زیادہ بلند ہیں (۲)۔

انگریزوں کے لیے تو کسی ملکی تنظیم کا مجرد آزادانہ قیام ہی شکوک و شبہات کے لیے کافی تھا۔ مسلمانوں کی تنظیم واصلاح اور قدیم اور جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تربیت، قیام مدارس و نظام مبلغین اسلام کی تیاری وغیرہ کے عزائم تو حکومت کے شبہات کو یقین میں بدل دینے کے لیے کافی تھے۔ چناں چہ حکومت اسی وقت چوکنی ہوگئی۔ اس نے مولانا احمد حسنؒ امروہوی سے اس سلسلے میں پوچھ گچھ کی اور حضرت شیخ الہند کی آمدنی پر ٹیکس لگا دیا گیا۔ حضرت اُس وقت دارالعلوم سے صرف پچاس روپے مشاہرہ وصول فرماتے تھے (۳)۔

جمعیت کے قیام پر زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ حکومت کو یقین ہو گیا کہ اُس کے سامنے صرف وہی مقاصد نہیں جن کا اعلان کیا گیا ہے یا اس کے اجلاس میں پاس شدہ تجاویز سے ہوتا ہے۔ حکومت کے خلاف بھڑکانے والی انجمن ہے اور جمعیت الانصار کے پردے میں مسلمانوں کو منظّم کیا جارہا ہے۔ ریشمی رومال سازش کیس میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے :

☆☆ ”جلد ہی مولوی عبید اللہ نے انگریزی پڑھے ہوئے نوجوانوں کو طالب

علم کی حیثیت سے لینا شروع کر دیا اور اس انجمن نے نیم سیاسی نوعیت اختیار کر لی۔ جب جنگ بلقان شروع ہوئی اور دیوبند کے ذمہ داروں نے ترکی کی مالی امداد کے جواز کا فتویٰ دیا۔ تو اچانک جمعیت الانصار اپنے اصلی رنگ میں آگئی اور انتہائی متعصب سیاسی جماعت بن گئی۔

☆ مولوی، طلبہ اور دوسرے لوگ مبلغ بنا کر بھیجے جانے لگے اور ترکی کی مدد کے لیے ہلال احمر فنڈ میں بڑی بڑی رقمیں جمع کی جانے لگیں۔

☆ غیر ملکی سامان کے بائی کاٹ کی تبلیغ بڑے شدومد سے کی جانے لگی۔

☆ اس کی شاخ قاسم المعارف نے کلکتہ میں چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں بڑی سرگرمی دکھائی۔

☆ اس پر مدرسہ کے عملے کے سنجیدہ لوگ چوکنے ہوئے اور ایسے اختلافات پیدا ہوئے کہ عبید اللہ کو ۱۹۱۳ء میں استعفاد ینا پڑا"۔

(تحریک شیخ الہند۔ ریشمی خطوط سازش کیس: (اشاعتِ کراچی): ص ۴۳۵)

حضرت شیخ الہند کی عظمت:

اسی ریشمی رومال سازش کیس" میں حضرت شیخ الہند کے بارے میں کہا گیا ہے کہ:

☆ دیوبند میں ان کا مکان اتحادِ اسلامی کی سازشوں کا گڑھ تھا

☆ انھوں نے سیف الرحمٰن، فضل الٰہی، فضل محمود وغیرہ کو سرحد پار قبائلیوں کو جہاد پر بھڑکانے کے واسطے بھیجا۔

☆ ہندوستان میں اتحادِ اسلامی کی سازش میں مولانا (محمود حسن) کی رہنمایانہ اور قائدانہ شخصیت بڑی سرگروہ ہے"۔ (ایضاً: ص ۴۴۲)

یہ تھے مولانا محمود حسن، جن کی شخصیت کا خمیر قوم و ملت کی ہم دردی اور غم خواری کی مٹی سے اٹھایا گیا تھا۔ جنھوں نے دیوبند کے مدرسۂ اسلامیہ میں ملت کے لیے ایثار و غم خواری کا سبق حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی سے پڑھا تھا اور جب ان کی عمر ستر برس کی تھی تو انھیں جوارِ حرم میں گرفتار کر کے ملت کے عشق کے جرم میں کامل تین سال کے لیے جزیرۂ مالٹا

میں قید کر دیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

"مولانا مرحوم ہندوستان کے گذشتہ دورِ علماء کی آخری یادگار تھے۔ ان کی زندگی اس عہد حرمان وفقدان میں علمائے حق کے اوصاف وخصائل کا بہترین نمونہ تھی۔ ان کا آخری زمانہ جن اعمال حقہ میں بسر ہوا تھا۔ وہ علمائے ہند کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے، ستر برس کی عمر میں جب ان کا قدان کے دل کی طرح اللہ کے آگے جھک چکا تھا، عین جوارِ حرم میں گرفتار کیے گئے اور کامل تین سال تک جزیرۂ مالٹا میں نظر بند رہے۔ یہ مصیبت انھیں صرف اس لیے برداشت کرنا پڑی تھی کہ اسلام وملتِ اسلام کی تباہی وبربادی پر ان کا خدا پرست دل صبر نہ کر سکا اور انھوں نے اعدائے حق کے مرضات واہوا کی تسلیم واطاعت سے مردانہ وار انکار کر دیا تھا۔ فی الحقیقت انھوں نے علمائے حق وسلف کی سنت زندہ کر دی اور علمائے ہند کے لیے اپنی سنتِ حسنہ یادگار چھوڑ گئے"۔ (خطبۂ صدارت جمعیت علمائے ہند" (اجلاس سوم لاہور)، قومی دارالاشاعت میرٹھ، ص ۱۰)

عملِ حق اور اس کا نتیجہ:

حضرت قاسم العلوم نے حریتِ فکر اور عزیمتِ دعوت کی تخم ریزی کا جو عملِ حق انجام دیا تھا، حضرت شیخ الہند نے اُس شجرِ طیب کی آبیاری کی اور اس کی نشوونما وحفاظت کے اعمالِ حقہ میں اپنی زندگی کے شب وروز گزار دیے اور یہ انھیں اعمالِ حقہ کا نتیجہ تھا آپ کی وفات پر ابھی پورا ایک قرن نہ گزرا تھا کہ براعظم پاک وہند آزاد ہو گیا اور جنوب مشرقی ایشیا سے لے کر وسطِ ایشیا اور جنوب مشرقی افریقہ تک پچاسوں ممالک رفتہ رفتہ آزاد ہونا شروع ہو گئے اور جس استعمار کی حکومت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا، وہ سمٹ کر ایک چھوٹے سے خطۂ زمین میں محدود ہو کر رہ گئی۔

میری ناچیز رائے میں دارالعلوم دیوبند کا عہدِ محمودی کوئی الگ دور نہیں بلکہ دورِ قاسمی کا تکملہ ہے۔

۱) قواعد و مقاصد جمعیۃ الانصار لطلبۃ المدرسۃ العالیۃ الاسلامیۃ الدیوبندیہ، منظور شدہ جلسۂ منعقدہ ۱۳ / محرم ۱۳۲۸ھ، احمدی پریس، علی گڑھ۔ قاسم المعارف کے نام سے جمعیت الانصار کی کلکتہ اور سندھ میں شاخیں بھی قائم ہوئی تھیں۔ کلکتہ شاخ کا ذکر ریشمی خطوط سازش کیس میں آیا ہے۔ سندھ کی شاخ کے قواعد و مقاصد مستقل کتابچے کی شکل میں مطبع قاسمی دیوبند سے چھپوا کر مولانا عبید اللہ سندھی نے شائع کیے تھے۔

۲) تجاویز کے مطالعے کے لیے "قواعد و مقاصد جمعیۃ الانصار" ...... یا "تذکرہ شیخ الہند" (از مفتی عزیز الرحمٰن) سے رجوع کرنا چاہیے۔

۳) حضرت شیخ الہند نے جب دار العلوم میں خدمات تدریس انجام دینا قبول فرمایا تھا تو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے اصرار سے پندرہ روپے مشاہرہ مقرر ہوا تھا۔ پھر کئی بار میں پچاس روپے تک اضافہ ہوا۔ حضرت گنگوہیؒ کے انتقال کے بعد پچھتر روپے آپ کی تنخواہ تجویز کی گئی لیکن یہ اضافہ آپ نے قبول نہ فرمایا اور آخر میں تو اسے بھی لینا ترک کر دیا تھا۔ ۱۹۱۱ء میں جب حضرت کی پچاس روپے تنخواہ پر ٹیکس لگایا گیا تھا تو دار العلوم ہی میں مدرسین سے لے کر اربابِ اہتمام تک کئی حضرات کی تنخواہیں اس سے زیادہ تھیں لیکن برٹش حکومت کی یہ خصوصی نظر صرف شیخ الہندؒ کے لیے وقف تھی۔

مولانا عبید اللہ سندھی کے خلاف الزامات اور پس منظر کے واقعات و شخصیات

اس بارے میں کوئی شک نہیں کہ دارالعلوم دیوبند کے قیام کا ایک مقصد ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی ناکامی کی تلافی تھا لیکن جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے۔ قیام کے اس مقصد پر تعلیم و تدریس کا پردہ ڈال دیا گیا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ نانوتوی اور ان کے بعد ان کے جانشین علمی و فکری مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ نہایت احتیاط اور پوری رازداری کے ساتھ اس مقصد کے حصول کے لیے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے۔ حضرت شیخ الہند نے فروغ تحریک، تنظیم جماعت اور عمل و انقلاب کے میدان میں قدم رکھا۔ مولانا عبید اللہ سندھی حضرت کے دست راست اور ایک بہت فعال سیاسی کارکن تھے۔ وہ دیوبند میں تنظیم جماعت، تعلیم و تبلیغ سیاسی اور سندھ و سرحد کے انقلابی عناصر اور ملک کے جدید تعلیم یافتہ حضرات سے رابطے کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان تمام کاموں میں انھیں حضرت شیخ الہند کا مشورہ اور رہنمائی حاصل تھی۔ اب جب کہ دارالعلوم کے ارباب اہتمام نے دیکھا کہ وہ دیوبند میں برٹش حکومت کے خلاف بغاوت کی خطرناک تحریک چلا رہے ہیں، جسے انگریز کسی قیمت پر برداشت نہیں کرسکتا اور اس کی ناراضگی سے یقیناً ان کے خاندانی مفادات کو نقصان پہنچے گا، تو انھوں نے اس تحریک کی مخالفت شروع کردی اور چوں کہ بہ قول مولانا مفتی عزیز الرحمٰن کے حضرت شیخ الہند کا تو کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے،

نزلہ بر عضو ضعیف کے مصداق مولانا سندھی کو اپنی مخالفت کا ہدف بنایا۔ اس کے لیے انھوں نے دو طریقے استعمال کیے

۱۔ ان کے ساتھیوں کو ان سے توڑا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی (دیوبندی)، مولانا انور شاہ کاشمیری اور مولانا غلام رسول خان (ہزاروی) کو ان کے خلاف ورغلایا اور انھیں ان سے الگ کر دیا۔

۲۔ بعض مسائل میں مولانا سندھی مرحوم کے علمی و تحقیقی افکار اور بعض اقدامات کو ہدف تنقید بنایا گیا۔ دار العلوم کی فضا کو ان کی مخالفت کے سانچے میں ڈھال دیا گیا۔ ان کے ساتھیوں کو ان سے لڑا دیا گیا۔ اس سلسلے میں جو مسائل پیدا کیے گئے تھے، یہ تھے

الف :غیر مسلموں میں عدم تبلیغ یا کماحقہ تبلیغ نہ ہونا اور اس بنا پر ان کی بریت یا عدم بازپرس کا اعتقاد

ب :ہندو مسلم اتحاد کا مصالح دینی و ملی کے خلاف ہونے کا مسئلہ

ج :جدید تعلیم یافتہ حضرات کی قدر افزائی سے نیچریت اور بے دینی کے فروغ اور دیوبند کے تشخص کو اس سے نقصان پہنچانے کا الزام۔

د۔ دار العلوم میں مولانا محمد علی کی عزت افزائی کا واقعہ

اگر چہ یہ اختلاف کوئی الگ اور اصولی اختلاف نہ تھا اور اس سے مولانا سندھی کا کوئی تعلق بھی نہ تھا، لیکن اسے خاص اہمیت دی گئی اور ان کے خلاف اس واقعے کو بہ طور ایک حربے کے استعمال کیا گیا۔

ہ۔ ایک اور مسئلہ۔ اس کی تفصیل آئندہ صفحات میں اپنے مقام پر آئے گی۔

ان مسائل و واقعات کی حقیقت کیا تھی؟ کیا مولانا سندھی نے واقعی کوئی ایسا عقیدہ ایجاد کیا تھا، جو کفر تھا اور جس کو ماننے والا واجب القتل ٹھہرتا تھا؟ کیا انھوں نے واقعی کوئی ایسے اعمال انجام دیے تھے، جن سے علی گڑھ کے

نیچریوں کویا جدید تعلیم یافتہ بے دینوں کو تقویت ملی تھی اور جس سے دیوبند کی عزت خاک میں مل گئی تھی؟ اور کیا واقعی مولانا محمد علی کی قدر افزائی سے دارالعلوم کا تقدس پامال ہو گیا تھا؟

آئندہ سطروں میں ان مسائل وافکار کو الگ الگ موضوع بنا کر بحث کی جائے گی۔

(۱)
مسئلہ تبلیغ

مذہبی اعتبار سے واحد مسئلہ تبلیغ کا تھا دیگر مسائل میں ایک مسئلے کے استثناء کے بعد سب کا تعلق سیاسی مفادات و مصالح سے تھا۔

مولانا سندھی مرحوم کا خیال تھا کہ دعوت اسلام

الف حکمت اور

ب: موعظتہ حسنہ کے ساتھ مشروط ہے اور

ج: جدل و بحث کی ضرورت پڑے تو وہ بہ طریق "احسن" ہونی چاہیے۔

حکمت و موعظت میں یہ چیز شامل ہے کہ دعوت مخاطبین کی زبان میں دی جائے، ان کی ذہنی و دماغی سطح کے مطابق تفصیل یا اجمال اور استدلال یا تمثیل سے کام لیا جائے اور ان کے دل و دماغ، فکر یا جذبات کو انگیخت کیا جائے، ان کی نفسیات کو سمجھ کر انھیں بلایا جائے، ان کی عادات و اطوار، ان کی روایات اور رسوم اور تاریخ و تہذیب کو، جس کی ذہن پر سخت گرفت ہوتی ہے۔ اور ان کی قیود کو انسان کے لیے توڑنا بہت مشکل ہوتا ہے، نظر انداز نہ کر دینا چاہیے۔ اس کے علاوہ پوری دردمندی، دل سوزی، غم گساری اور مخاطبین سے سچی ہمدردی کو بروے کار لایا جائے۔ یہ مسلمانوں کے فرائض اسلامیہ و شرعیہ ہیں۔ اگر وہ انھیں بجا نہیں لاتے تو اتمام حجت نہیں ہوتا۔ قرآن حکیم کسی پہاڑ یا بے جان و بے حس شے پر نازل نہیں ہوا تھا۔ داعی اسلام (علیہ الصلوٰۃ والسلام) گوشت پوست، احساس و شعور کے مالک انسان تھے۔ آپ میں تمام بہترین اور لطیف انسانی جذبات موجود تھے۔ انسانیت کے ہمدرد و غم گسار تھے۔ قرآن حکیم مخاطبین کی زبان میں، ان کے پسندیدہ اور ادب کے دل کش اور معیاری اسلوب میں نازل ہوا تھا، داعی اعظم علیہ السلام نے حکمت کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھا تھا اور موعظتہ حسنہ کے تمام شرائط کو پورا فرمایا تھا تو حجت تمام ہوئی تھی۔ حضور

نبی کریم علیہ السلام نے عملاً عرب میں اور اصولاً تمام عالم انسانیت میں حجت تمام فرمائی تھی۔ آپ کے بعد آپ کے وارثین یعنی علمائے کرام کو دنیا کی تمام اقوام میں، الگ الگ ملکوں میں اور ان کی زبانوں میں، ان زبانوں کے بہترین اسلوب تحریر وبیان میں، حالات ووقت کے تقاضوں کے مطابق، ہر قوم کی تاریخی، تہذیبی، روایات ورسوم کے پس منظر کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ان کی ذہنی وفکری سطح کے مطابق، اجمال یاتفصیل اور استدلال یاتمثیل کے طریق تعلیم وتبلیغ سے کام لے کر حجت تمام کرنی ہے۔

اسلام کے داعی اعظم (علیہ الصلوٰۃ والتسلیم) کے خصائص نبوت میں،

۱- قرآن حکیم کی تعلیم دینا۔

۲- اللہ کی نشانیوں کی طرف توجہ دلانا یعنی معرفت الٰہی کی تعلیم دینا۔

۳- حکمت کی باتیں سکھانا۔

۴- قلوب کا تزکیہ اور باطن کی صفائی کرنا، ذہن وفکر کو جلا دینا، جذبات وخیالات کی تطہیر کرنا اور باطن میں سعادت وصلح کی تخم ریزی کرنا۔

۵- جہالت سے علم کی روشنی میں لانا۔ ان باتوں کو بتانا اور سکھانا جو ان کے لیے نامعلوم اور غیر محسوس ہوں۔

اس میں عاقبت اور آخرت کی باتیں، اعمال کے خواص اور نتائج کی طرف توجہ دلانا، تمام باتیں آجاتی ہیں۔

(۲: ۱۲۹ اور ۱۵۱)

دعوت وتبلیغ کے سلسلے کی یہ تمام باتیں امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے علما کے فرائض میں شامل ہیں۔ اب اگر وہ اپنے فرائض سے غفلت برتتے ہیں اور انسانیت کے کسی طبقہ وقوم کو دعوت اسلام سے محروم رکھتے ہیں تو اس بات میں تو شک ہے کہ اللہ تعالیٰ محرومین دعوت کو بخشے

گیا نہیں۔ یہ بات تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ مشیت الٰہی ان کے ساتھ کچھ بھی برتاؤ کر سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے۔ یقین ہے کہ ان میں جس درجے میں تبلیغ ہوئی ہوگی، اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ اسی درجے اور اسی قسم کا معاملہ بخشش وگرفت فرمائے گا۔ لیکن اس بارے میں کوئی شبہ نہیں کہ علمائے امت دعوت وتبلیغ اسلام سے غفلت وکوتاہی اور اغماض کے مجرم ضرور قرار پائیں گے۔ یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ محرومین سعادت کو علمائے امت کی بے عملی کی سزا نہیں دے گا۔

حکمت وموعظت کے تمام تقاضے پورے کرنا وقت کے داعیان کرام کا کام ہے اور قبولیت حق کے لیے مخاطبین کے دلوں کے دروازے کھولنے کا تمام ظاہری سروسامان کرنا مبلغین اسلام کا فرض ہے۔ یہ ان کے فرائض اسلامیہ وشرعیہ میں داخل ہے۔ اگر انھوں نے یہ حجت تمام کر دی تو ان کا فرض ادا ہوگیا لیکن اگر اتمام حجت میں کوئی خامی رہ گئی تو پہلے وہ خود اس کے لیے جواب دہ ہوں گے، بعد میں مخاطبین سے عدم قبولیت کے لیے بازپرس کی جائے گی۔ قبولیت حق کے لیے دلوں کے دروازوں کا واقعی کھولنا یا نہ کھولنا اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اس قبولیت حق کے لیے داعیوں اور مبلغوں کو ذمہ دار نہیں بنایا گیا ہے۔ دعوت اسلام اور تبلیغ حق کی کامل درجے میں اتمام حجت کے بعد بھی اگر مخاطبین دعوت اسلام قبول نہ کریں تو وہ اصطلاح اسلامی میں "کافر" کہلائیں گے۔ لیکن جن قوموں میں حکمت وموعظت کے قواعد وشرائط کے ساتھ اسلام کی دعوت ہی نہ دی گئی ہو ان پر "انکار" (کفر) کا اطلاق ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ بات عدل الٰہی سے بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے "کفر" کی بازپرس کرے۔ یہ کہنا کہ قرآن نازل ہوگیا اور بحروبر پر اللہ کی حجت تمام ہوگئی۔ اب اسلام کے قبول وعدم قبول کے لیے دنیا کا ہر انسان اپنے طور پر خود جواب دہ ہے، عقل سے بعید بات ہے۔

اقطار عالم میں آج بھی ایسی بہت سی اقوام ہیں۔ جن تک ابھی علم وتہذیب کی روشنی نہیں پہنچی ۔ وہ جنگلوں، بیابانوں اور پہاڑوں میں تہذیب ومعاشرت سے بہت دور اپنے مخصوص گرد وپیش میں فطری زندگی گزار رہی ہیں۔ خود ہندوستان اور پاکستان کے جنگلوں اور پہاڑوں میں ایسی متعدد اقوام موجود ہیں جو آج تک علم وتہذیب کی روشنی سے محروم اور مذہب واخلاق کے نام سے ناآشنا ہیں۔ ان سے ان کے کفر کی باز پرس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ اگر دعوت وتبلیغ بحکمت وموعظت کے تمام شرائط کے ساتھ مسلمانوں کے علمائے دین کے فرائض میں شامل ہے تو ان سے ان کی عدم ادائیگی کی باز پرس ضرور ہوگی۔ مسلمان اور خصوصا علماء اپنی بے عملی اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کے لیے ایسی اقوام کو ”کفر“ کا الزام نہیں دے سکتے۔

اور جہاں تک دعوت وتبلیغ کے حق کا تعلق ہے، تو وہ تو ہندوستان کی معروف ومتمدن اقوام میں بھی حکمت وموعظۂ حسنہ کے تمام شرائط کے ساتھ ادا نہیں ہوا۔ اسلام کی حقانیت کے اثبات اور فرق ومذاہب باطلہ کے رد میں کچھ لٹریچر چھاپ دینا اور گلی کوچوں اور بازاروں کے مناظروں میں کسی مذہبی مبلغ یا مناظر کو ہرا دینا بہت بڑے اور وسیع میدان عمل کے ایک چھوٹے سے گوشے کی بات ہے۔ اگرچہ ایک درجے میں اس کی بھی اہمیت ہے، لیکن اقوام وعوام میں دعوت وتبلیغ کے فریضۂ شرعیہ کی واقعی ادائیگی سے بہت دور کی بات ہے۔

جہاں تک دعوت وتبلیغ اسلام کے حق کا تعلق ہے تو واقعہ یہ ہے کہ قرن اولیٰ کے بعد اس پر توجہ ہی نہیں دی گئی۔ ملکوں کو فتح کیا گیا، قوموں پر غلبہ حاصل کیا گیا، مسلمانوں کی حکومتوں کا قیام عمل میں آیا لیکن حق تبلیغ ودعوت اسلام نہ ملکوں کی فتوحات اور حکومتوں کے قیام سے پہلے ادا کیا گیا نہ بعد میں اس طرف توجہ دی گئی۔ بلاشبہ صوفیہ کے مقدس طبقے نے اپنے انداز سے اسلام کی اشاعت میں حصہ لیا لیکن ان کی تحریک کو بھی مسلمان بادشاہوں،

حکمرانوں اور فاتحوں سے کوئی تقویت نہیں پہنچی، بلکہ بعض اوقات تو خود انھیں بھی مسلمان بادشاہوں اور حاکموں کے ظلم وجور کا نشانہ بننا پڑا۔

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم نے تبلیغ پر ان خیالات کا اظہار کیا تھا، تو بالکل صحیح کیا تھا۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ جس ماحول میں وہ تھے وہاں اس مسئلے کو چھیڑنے کی قطعاً ضرورت نہ تھی اور نہ ان کے پیش نظر جو مقاصد مہمہ سیاسیہ وملیہ تھے ان کو اس بحث سے کوئی فائدہ پہنچ سکتا تھا اور نہ پہنچا بلکہ ان کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہوگئی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو مولانا سندھی کے خیالات اور بحث و اختلافات کا پتا چلا تو انھوں نے فرمایا کہ مسئلہ وہی ہے لیکن اس کے چھیڑنے کی ضرورت نہ تھی۔ حضرت شیخ الہند کے اظہار وبیان سے بھی مولانا سندھی کے خیالات کی تردید نہیں تائید ہوتی ہے۔

مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم لکھتے ہیں کہ حضرت شیخ الہند نے فرمایا:

"انفرادی طور پر یہ بات کہ تبلیغ کسے کس درجے کی ہوتی ہے حق سبحانہ وتعالیٰ ہی اسے جانتے ہیں اور مواخذہ بھی وہی اپنے علم کے مطابق کریں گے... تفصیلی علم تو اس کا خدا ہی کو ہے۔ ہمارے لیے اتنی اجمالی بات کافی ہے کہ جسے جس حد تک تبلیغ ہوئی ہے، اسی حد تک اس سے مواخذہ بھی ہوگا۔ اشخاص کو متعین کرکے یہ بتانا آدمی کے لیے ناممکن ہے کہ کسے کس درجے کی تبلیغ ہوئی ہے اور جب تبلیغ کے مدارج کا تفصیلی علم نہیں ہوسکتا تو مواخذے کی تفصیل بھی ہم کیسے کرسکتے ہیں۔" (ماہنامہ دارالعلوم (دیوبند)، جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ ص ۴۱)

مولانا گیلانی نے حضرت کی اس تقریر کو "شستہ ورفتہ اور اس مسئلے میں حرف آخر قرار دیا ہے۔ انھوں نے حضرت کے جواب دینے کے انداز کو بھی بیان کردیا ہے۔ فرماتے ہیں:

"بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے جلسے کی تقریروں کی

خبریں حضرت تک بھی پہنچ چکی تھیں، جن سے متاثر تھے اور خلاف دستور دیکھا کہ ذرا سنبھل کر متوجہ ہوگئے اور ایک ایسی شستہ درفتہ تقریر اس مسئلے پر فرمائی جو خاکسار کے نزدیک "حرف آخر" کی حیثیت رکھتی ہے" (ایضاً)

مولانا گیلانی مرحوم نے اس مسئلے پر اپنی بلند پایہ و فکر انگیز تصنیف "الدین القیم" میں حضرت شیخ الہند کے درس ترمذی کی اسی صحبت کے حوالے سے "مسئلہ تبلیغ اور مواخذہ" کا عنوان قرار دے کر حضرت مجدد الف ثانی کے افادات وکشف اور تفسیر قرآن پر مبنی نہایت مفصل اور جامع بحث کی ہے اور اس میں "حضرت شیخ الہند کا تحقیقی بیان" کے ذیلی عنوان کے تحت حضرت کے انھی افادات سے استدلال کیا ہے۔ حضرت مجدد کا ارشاد ہے۔

"حضرت حق سبحانہ تعالیٰ باکمال رافت و رحمت خود بندہ را بہ مجرد عقل کہ مجال خطا و غلط درو ے بسیار ست بے آنکہ ابلاغ مبین بہ توسط انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات فرمایند در آتش مخلد سازد و عذاب گرفتار سازد۔"

(ترجمہ) اپنی انتہائی رحمت و مہربانیوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بندوں کو صرف اس عقل کے حوالہ نہیں کیا جس میں غلطی اور صحت دونوں کی گنجائش بہت زیادہ ہے، بلکہ اسی رحمت و رافت کا اقتضا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے پوری پوری تبلیغ کیے بغیر کسی کو آگ کے ابدی عذاب میں گرفتار نہ کرے۔"

حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ مزید فرماتے ہیں کہ

"باوجود عقل و ہوش کے جن لوگوں تک دین اور دین کے پیش کرنے والے پیغمبروں کا علم صحیح طور پر نہیں پہنچا، یعنی ابلاغ مبین ان کو نہ ہو سکا ان کے متعلق جہاں یہ فیصلہ دشوار ہے کہ وہ جہنم کے ابدی عذاب میں گرفتار ہوں۔"

اسی طرح فرماتے ہیں:

گراں است حکم کردن او را باجود شرک بخلود جنت

(ترجمہ) "ان لوگوں کے متعلق (جنھیں پورے طور پر پیغمبروں کے پیغام کی تبلیغ نہیں ہوئی) یہ فیصلہ بھی دشوار ہے کہ باوجود مشرک ہونے کے ان کو جنت کی ابدی زندگی کا حق قرار دیا جائے۔"

حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا تحقیقی بیان:

اس فیصلے کی دشواری کے لیے مولانا گیلانی نے حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے ایک کشف کا بھی ذکر کیا ہے۔ لیکن اس بیان کے بعد کہ عقائد کے باب میں کشف حجت نہیں ہے، حضرت شیخ الہند کے بیان کو "تحقیقی" قرار دیتے ہوئے، اسی کو اس مسئلے کی دشواری کا آخری حل اور پختہ و تشفی بخش فیصلہ قرار دیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ "آخری بات جو اس سلسلے میں کہی جاسکتی ہے وہ یہی ہے۔" اب آپ مولانا گیلانی کا پورا بیان مطالعہ فرمائیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"غالباً ترمذی کا درس ہورہا تھا، حلقہ درس میں ایک دیوانہ بھی تھا(۱)، اس نے ایک خاص وجہ سے جس کا تعلق ایک وقتی مسئلہ سے تھا کچھ اسی نوعیت کا سوال کیا۔ جواب میں حضرت الاستاذ قدس سرہ نے جو بات ارشاد فرمائی تھی، اس وقت تو اس کی قیمت کا اتنا اندازہ نہ ہوا، لیکن جب جنون کے چند میدان اور طے ہوئے، تب وہ بات یاد آئی اور وہی اس معمہ کا اس فقیر کے نزدیک "آخری حل" ہے۔ ارشاد ہوا کہ

تبلیغ کے مراتب بھی متفاوت ہیں، ایک تبلیغ ابوبکر صدیق، عمر فاروق رضی اللہ عنہما کو ہوئی، ایک تبلیغ مثلاً عام صحابیوں کو ہوئی۔ پھر یوں ہی تابعین، تبع تابعین کو ہوتی ہوئی، مثلاً ہم جیسوں

(۱) حضرت مولانا گیلانی کا اشارہ اپنی ذات گرامی کی طرف ہے (ا۔س۔ش)

تک پہنچی 'بلاشبہ ہمیں بھی تبلیغ ہوئی لیکن جیسی ابوبکر رضی اللہ عنہ و عمر رضی اللہ عنہ جیسے رفقاے کار (صحابہ رضی اللہ عنہم) کو ہوئی 'ہماری تبلیغ کی نوعیت وہ نہیں ہو سکتی۔ یہ تو ایمان والوں کا حال ہوا۔ پھر جنھوں نے انکار کیا' ان میں ایک انکار ابو جہل کا ہے اور ایک انکار فرض کرو کہ ہندوستان کے کسی دیہاتی ہندو گنوار کا ہے۔ ظاہر ہے کہ تبلیغ کے لحاظ سے دونوں کا درجہ بھی ایک نہیں ہے۔ یہ تو پہلا مقدمہ ہوا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ مواخذہ الٰہی کے مراتب بھی متفاوت ہیں یعنی جس درجہ کی تبلیغ جس کسی کو ہوئی ہے 'اسی درجہ کا مواخذہ بھی اس سے ہو گا۔

فرمایا گیا کہ بس کلیہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جسے جس درجہ کی تبلیغ ہوگی' مواخذہ الٰہی بھی اسی درجہ کا اس کے ساتھ متعلق ہو گا اور اسی لحاظ سے اس کی گرفت بھی ہوگی۔ یہ تو کلیہ ہوا لیکن جزئیات پر اس کلیہ کو کیسے منطبق کیا جائے یعنی شخصی طور پر یہ بتانا کہ کسے کس درجہ کی تبلیغ ہوئی اور اس کا مواخذہ کس درجہ کا ہو گا' ظاہر ہے کہ دونوں (یعنی تبلیغ و مواخذہ الٰہی) کے مراتب لامحدود ہیں 'اس کا متعین و مشخص علم حق تعالٰی ہی کو ہو سکتا ہے اور ان ہی کا علم فیصلے کے لیے کافی ہے۔ ہمیں صرف اتنا ماننا چاہیے کہ جیسی تبلیغ ہوگی 'گرفت و مواخذہ بھی اسی کی مطابق ہو گا' یہ بالکل ممکن ہے کہ ایک شخص یورپ میں ہو 'اس نے تحقیق و تلاش کے ذریعے سے تبلیغ میں اپنا درجہ اونچا کر لیا ہو 'اور ایک شخص مسلمانوں ہی کے درمیان رہتا ہو مثلاً ہندوستان کے سیکڑوں ہندو وغیرہ اقوام کا حال ہے کہ ان پر جہل و غفلت طاری ہے۔ پس خدا ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ کس کو کس درجہ کی تبلیغ ہوئی۔ البتہ ہم اتنا جانتے ہیں کہ تبلیغ کے جس درجہ تک پہنچ کر اس نے انکار کیا ہے اسی لحاظ سے اس کی پکڑ ہوگی۔"

اس بیان کے بعد مولانا گیلانی مرحوم نے نہایت ذمہ دارانہ طور پر یہ

صراحت بھی کر دی ہے

"ظاہر ہے کہ تقریباً اٹھائیس انتیس سال قبل کی یہ بات ہے، بجنسہ الفاظ تو میں نے حضرت کے ادا نہیں کیے ہیں لیکن ان شاء اللہ مفہوم یہی تھا۔ اس حلقہ درس کے رفقا اگر دنیا کے کسی حصہ میں موجود ہوں گے تو وہ اس کی شہادت ادا کر سکتے ہیں۔"

آخر میں مولانا گیلانی مرحوم نے حضرت شیخ الہند کے جواب کے بارے میں اپنے ایقان کا مزید اظہار بھی کر دیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں:

"کچھ بھی ہو بات یقیناً پختہ ہے اور آخری بات اس سلسلہ میں جو کہی جا سکتی ہے وہ ان شاء اللہ یہی ہو سکتی ہے۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کا کلام مجھے بعد کو ملا اور سورہ فاتحہ کی تفسیر سہ گانہ کی طرف بھی ذہن بعد کو منتقل ہوا(۱) افسوس ہوا کہ اس وقت یہ چیزیں سامنے ہوتیں تو حضرت الاستاذ رحمتہ اللہ علیہ سے کچھ اور مزید استفادہ کا موقع ملتا۔ لیکن طالب علمی کے معلومات ہی کیا ہو سکتے تھے۔ یہی غنیمت ہے کہ سوال کر سکا۔ اور جواب کسی نہ کسی طرح دماغ میں محفوظ رہا جو آج بحمد اللہ کام آیا۔ مسلمانوں میں ایک بڑا طبقہ آج کل پیدا ہو گیا ہے، جس کے دل میں یہ سوال آتا ہے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ حضرت الاستاذ رحمتہ اللہ علیہ کا جواب ان کی تشفی کر دے گا۔"

یقین رکھنا چاہیے کہ مولانا سندھی مرحوم نے اپنے محبوب استاد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے فکر و منشا کے خلاف یا اس سے زائد ایک حرف نہ کہا ہو گا۔ اور اگر حضرت کا بیان اس بات میں "حرف آخر" کی حیثیت رکھتا ہے تو

---

(۱) "الدین القیم" میں حضرت گیلانی نے "غیر المغضوب علیہم ولا الضالین" کی نہایت فکر انگیز تفسیر بیان فرمائی ہے۔ خصوصاً "ضلالت" سے مراد اور اس کے درجات پر بہت عمدہ بحث کی ہے۔ لیکن طوالت کے خیال سے یہاں اسے نقل نہیں کیا۔ جو اصحاب تفصیلی مطالعے کے شائق ہوں انھیں اس سے رجوع کرنا چاہیے۔ (ا۔س۔ش)

مولانا سندھی کے افکار کم از کم دیوبندی مکتبہ فکر میں حرف آخر ہی کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور حضرت علامہ انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی معذرت اور "غلط فہمی" کے اعتراف نے تو قطعی طور پر فیصلہ کر دیا کہ مولانا سندھی کا مسلک ہی حق وصواب تھا۔ مولانا کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کو جوں ہی پتا چلا کہ مولانا سندھی کابل سے روس اور ترکی کے بعد حجاز پہنچ گئے ہیں، تو ایک ذریعے سے ان سے عفو کے طالب ہوئے۔ اس سلسلے میں جو روایت ہمارے سامنے ہے، اس کا مختلف کتب ومضامین میں آیا ہے لیکن جہاں صحیح روایت کا اس کے اولین ماخذ سے حوالہ دیا جاتا ہے۔ یہ واقعہ ۱۹۲۸ء کا ہے اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایڈیٹر برہان نے ۱۹۴۵ء میں اس کا ذکر کیا ہے۔ مولانا اکبر آبادی لکھتے ہیں:

"۱۹۲۸ء میں جب کہ مولانا سندھی حجاز میں مقیم تھے، ہمارے رفیق کار مولانا محمد حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی حج کے لیے روانہ ہونے لگے اور حضرت الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ صاحب کی خدمت میں رخصت ہونے کے لیے حاضر ہوئے، تو حضرت شاہ صاحب نے آبدیدہ ہوکر رقت آمیز آواز میں فرمایا:

"بھئی مکہ میں مولانا عبید اللہ صاحب سے میرا بہت بہت سلام کہنا اور یہ پیغام پہنچا دینا کہ آپ کے قیام دیوبند کے زمانے میں میں آپ کے لیے باعث تکلیف بنا تھا۔ اس وقت مجھ کو اصل حالات کا احساس نہیں ہوسکا تھا۔ اب احساس ہوا ہے اور اصل حقیقت معلوم ہوئی ہے، تو مجھ کو بڑی ندامت اور انفعال ہے۔ اب میں یقین دلاتا ہوں کہ میرے دل میں آپ کی طرف سے کوئی تکلیف نہیں اور میں امید کرتا ہوں کہ اب آپ میری جانب سے کوئی دکھ نہ رکھیں گے۔""

(برہان، دہلی، بابت ماہ اپریل ۱۹۴۵ء، ص ۹۶-۹۵)

حضرت مولانا کاشمیری کی آبدیدگی اور رقت آمیزی کے ساتھ معذرت وعفو خواہی موجب تکلیف ہونے کا اعتراف، نیز اس وقت مولانا سندھی کے خلاف ہنگامے اور تضلیل و تکفیر کے اصلی پس منظر سے عدم واقفیت، اس غلطی کا احساس اور میرا اصل حقائق کے انکشاف کے بعد ندامت وانفعال کا نزول اور صفائے قلب کا جو بیان ہوا ہے، وہ مولانا سندھی کے دامن فکر کو ضلالت کے داغ سے پاک کر ہی دیتا ہے لیکن وہ خود حضرت کاشمیری کی سیرت اور اخلاقی عظمت کا بھی بہت بڑا ثبوت ہے۔

کاش! ہنگامہ وفتنہ کے دوسرے شرکا کو بھی اپنی غلطی کے اعتراف کی توفیق نصیب ہوتی۔

حضرت مولانا کاشمیری کی آبدیدگی اور رقت آمیزی کے ساتھ عفو وعفو خواہی اور موجب تکلیف ہونے کا اعتراف، نیز اس وقت مولانا سندھی کے خلاف ہنگامہ اور تضلیل و تکفیر کے اصل پس منظر اصل واقفیت کا اپنی غلطی کا احساس اور پھر اصل حقائق کا انکشاف اور ندامت وانفعال کا اظہار اور تکلیف کا دل سے صفا کا جو بیان یہاں ہوا ہے وہ مولانا سندھی کے دامن فکر کو ضلالت سے پاک ہونے کا ثبوت ہے ہی، لیکن خود حضرت کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی شرافت اور اخلاقی عظمت کا بھی بہت بڑا ثبوت ہے کاش! ہنگامہ وفتنہ کے دوسرے شرکاہ کو بھی اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کی توفیق الٰہی نصیب ہوتی

اگر یہ مسئلہ کسی درجے میں تھا بھی، تو ایک علمی مسئلہ تھا۔ اسلام کے بنیادی عقائد سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس مسئلے میں مخالفین ہی کی رائے کو درست مان لیا جائے، تب بھی اسے کفر اور اسلام کی کسوٹی قرار نہیں دیا جاسکتا۔ یہ بات نہایت متشددانہ اور ظالمانہ تھی کہ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کو کافر اور واجب القتل قرار دیا جائے اور صرف اس بنا پر دار العلوم سے ان کے تعلق کو منقطع کر دیا جائے۔ لیکن یہ بات تھی ہی کہاں؟ اسے تو صرف دیوبند سے

مولانا سندھی کے اخراج کا بہانہ بنایا گیا تھا۔ حقیقت تو کچھ اور ہی تھی۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری لکھتے ہیں:

"سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ علمی اختلافات تھے تو کیا یہ اختلاف اس قابل تھے کہ ایک سرگرم کارکن کو ضائع کر دیا جائے؟ اور پھر کیا یہ حالات صرف علامہ سندھی کے پیدا کیے ہوئے تھے؟

اگر غور کیا جائے تو اصل تحریک کے محرک اعلیٰ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ لیکن حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے کون ٹکر لیتا؟ حقیقت یہ ہے کہ جمعیتہ الانصار کے پروگرام اور اس کی تجاویز سے جہاں انگریزوں کو بوکھلاہٹ تھی، وہاں دار العلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کے اقتدار پر بھی شدید ضرب واقع ہو رہی تھی، جس کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ علامہ سندھی پر علمی اور مذہبی الزامات لگا کر ان کو علیحدہ کر دیا جائے۔" (تذکرہ شیخ الہند ص ۷۶-۱۷۵)

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ واقعتاً یہ کوئی علمی مسئلہ نہ تھا، بلکہ مولانا سندھی کو دیوبند سے نکالنے کے لیے محض ایک چال تھی۔ یہی مفتی بجنوری صاحب لکھتے ہیں:

"ارباب اہتمام دار العلوم دیوبند مولانا سندھی کی ان سرگرمیوں کو اپنے اور دار العلوم دیوبند کے لیے خطرے کی گھنٹی سمجھتے تھے اور اس خطرے کو مول لینے کے لیے ارباب اہتمام کسی طرح تیار نہ تھے۔ اس لیے انھوں نے علامہ سندھی کے خلاف چند مسائل کھڑے کیے، تاکہ ان کو دار العلوم سے یہ کہہ کر نکال دیا جائے کہ وہ اکابر کے مسلک سے ہٹ گئے ہیں یا گمراہ ہو گئے ہیں یا ان کے افکار و نظریات گمراہ کن ہیں۔ لہٰذا ایسے شخص کا دار العلوم کی چہار دیواری میں رکھنا طلبہ کے لیے مضر ہے۔ چناں چہ ارباب اہتمام نے چند مسائل کھڑے کیے اور مولانا کشمیری اور علامہ عثمانی کی "ٹکر" علامہ سندھی

سے کرادی۔ دیوبند میں ان ہر سہ حضرات کے درمیان مناظرہ ہوا، جو حقیقت میں مولانا سندھی کے نکالنے کے لیے ایک بہانہ تھا۔ چناں چہ علامہ سندھی کے خلاف ایک ہلڑ بازی کھڑی کردی گئی اور ان کی پوزیشن کو ملک میں مجروح کرنے کی ناکام کوشش کی گئی۔"

(ایضاً، ص ۱۷۴)

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی نے ارباب اہتمام دارالعلوم کے بارے میں نہایت حسن ظن سے کام لیا ہے لیکن پھر بھی انھیں تسلیم کرنا پڑا ہے کہ مولانا سندھی اور دارالعلوم کے دوسرے علما کے درمیان "اختلاف پیدا کرادیا گیا" تھا نہ کہ واقعی کوئی مسئلہ تھا۔ حضرت رحمتہ اللہ کے افکار پر مبنی یہ پورا بیان ملاحظہ فرمایئے۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"واقعہ یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کے سامنے دارالعلوم کا بقا و تحفظ سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات اور اس کے بعد انگریزی پالیسی ان کے سامنے تھی۔ انھوں نے مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگرمیوں کو نہ صرف دارالعلوم دیوبند بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی خطرناک تصور کیا اور اپنے خیالات کے مطابق ضروری سمجھا کہ مولانا سندھی کا تعلق اس مرکز سے نہ رہے۔

اس زمانے میں اتفاق سے چند علمی مسئلوں میں مولانا سندھی اور دارالعلوم کے دوسرے علما کے درمیان اختلاف پیدا کرادیا گیا۔ اسی اختلاف کو وجہ قرار دے کر مولانا سندھی کو دارالعلوم سے علیحدہ کردیا گیا۔ چناں چہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ (۱)

اس اختلاف نے اگرچہ دارالعلوم کے اساتذہ، ملازمین

---

(۱) رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کا یہ تحقیقی اندراج اس کتاب کا باب ہفتم بنادیا گیا ہے (ا۔ س۔ ش)

اور عام طلبہ کو حضرت مولانا سندھی سے بہت بعید کر دیا تھا، لیکن
حضرت شیخ الہند قدس سرہ العزیز سے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا۔
خفیہ آمدورفت جاری رہی۔ رات کی اندھیریوں میں دیوبند کے باہر
ملاقاتیں ہوتی رہیں اور ضروری باتیں انجام دی جاتی رہیں۔"
(نقشِ حیات ۲ :۵۱۔۱۵۰)

نقش حیات ہی میں ایک اور مقام پر حاشیے میں حضرتؒ نے ان مسائل کو "مسائل دینیہ مختلفہ فیہا" تحریر فرمایا ہے۔ اس باب میں ارباب اہتمام کے ساتھ زیادہ سے زیادہ جو رعایت برتی جاسکتی تھی، یہی تھی کہ "مسائل مختلفہ فیہا" قرار دے کر انھیں اختلاف کا حق دیا جائے۔ لیکن یہاں بھی ارباب اہتمام کی زیادتی یہ ہے کہ ان میں مولانا سندھی کو حق راے واختلاف دینے کے بجاے ان کی "تضلیل وتکفیر" کرائی گئی۔ اگر یہ مسئلہ واقعی مختلفہ فیہا تھا تو اس میں اختلاف باعث تضلیل وتکفیر کیوں کر ہوسکتا ہے۔ اس لیے حضرت شیخ الاسلام نے اس تضلیل وتکفیر اور دیوبند سے مولانا سندھی کی اخراج کی اصل وجہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ اصل وجہ سیاسی تھی۔ حضرت تحریر فرماتے ہیں:

"... بعض مسائل دینیہ مختلفہ فیہا کو درمیان میں رکھا گیا اور مولانا سندھی سے دوبلند پایہ معاصرین کو "بدظن کرکے تضلیل وتکفیر پر آمادہ کیا گیا اور اسی اختلاف کی بنیاد پر مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کو دارالعلوم دیوبند سے الگ کیا گیا" ان میں سے ایک بزرگ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چناں چہ انھوں نے مولانا سندھی سے معافی مانگی۔ بہرحال اصل سبب (مولانا سندھی کے اخراج کا) وہ امر ہے جس کی بنا پر مسٹن گورنر یوپی دیوبند اور دارالعلوم میں گیا تھا اور مہتمم صاحب کو شمس العلماء کا خطاب دیا تھا۔" (ایضاً ۲ :۲۴۴، حاشیہ)

حضرت شیخ الاسلام کا یہ حاشیہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ کے اس فقرے پر تھا کہ "عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور ومعروف دارالعلوم کے فارغ

التحصیل مولویوں کے ذریعے ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف ایک عالم گیر اسلامی (پان اسلامک) تحریک چلائے مگر مہتمم اور ارباب شوریٰ نے اس کو اور اس کے چند وابستگان کو نکال کر اس تجویز کو درمیان ہی میں ختم کر دیا۔
(نقشِ حیات ۲: ۲۴۴)

اگر واقعی کوئی اسلامی مسئلہ ہوتا یا دارالعلوم کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا تو اس طرح بھی خوش اسلوبی کے ساتھ طے ہو سکتا تھا کہ اسے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے سامنے پیش کر دیا جاتا۔ دینی مسئلے کی حیثیت میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کا ایک اشارہ مولانا سندھی کے رجوع کے لیے کافی ہوتا اور اگر دارالعلوم کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہوتا تو حضرت شیخ الہند مدرسہ کے دشمن تو نہیں تھے۔ وہ مدرسہ کے تحفظ اور تحریک کے جاری رکھنے کی بھی کوئی صورت نکال لیتے۔ وہ مولانا سندھی کو منع بھی کر دیتے، ان کی جدوجہد کو بعض حدود میں پابند کر دیتے یا جیسا کہ بعد میں کیا، ان کے مرکز کو تبدیل کر دیتے! لیکن معلوم ہے کہ ارباب اہتمام نے حضرت شیخ الہند کو اعتماد میں نہیں لیا، مولانا سندھی کے خلاف محاذ قائم کیا گیا، حضرت ہی کے بعض تلامذہ کو ان کے خلاف استعمال کیا، ان کے احتساب کے لیے ایک ایسے دن کا انتظار کیا، جب حضرت شیخ الہند دیوبند میں نہ ہوں، ان کے بعض خیالات کو کافرانہ اور انھیں واجب القتل قرار دیا۔ مولانا سندھی نے ان خیالات سے رجوع فرمالیا، توبہ کی، لیکن نہ ان کے رجوع کو قبول کیا، نہ توبہ تسلیم ہوئی۔ انھیں نہ صرف مدرسہ سے بے دخل کیا بلکہ دیوبند کی سرزمین کو ان پر تنگ کر دیا گیا اور دیوبند سے انھیں نکل جانے پر مجبور کیا۔ پھر ارباب اہتمام نے اس پر بھی اکتفا نہیں کیا، بلکہ ”حضرت شیخ الہند کے خلاف ریشہ دوانیاں کیں، حضرت کے متعلق حکومت کو اطلاعات فراہم کیں، حضرت کی گرفتاری کے لیے حکومت کو مشورہ دیا، شمس العلما مولانا محمد احمد مہتمم دارالعلوم نے بہ ذات خود حضرت کے ساتھ دہلی تک کا حضرت کی مخبری کے لیے سفر کیا

اور اپنی مرید ڈاکٹر انصاری کی بیوی کے ذریعے جاسوسی کی، ڈاکٹر صاحب اور حضرت کی گفتگو کا موضوع اور تفصیلات معلوم کرنے کا اسے ذریعہ بنایا، عبدالاحد نامی ایک شخص کو جاسوسی کے لیے حضرت شیخ کے ساتھ حجاز بھیجا، وہ واپس آیا تو حاصل شدہ معلومات سے ڈپٹی کلکٹر سہارن پور کے ذریعے گورنر یوپی کو مطلع کیا۔ دیوبند کے حالات اور حضرت شیخ الہند کی مصروفیات مشاغل اور کارگذاریوں کے بارے میں ماہانہ رپورٹیں دی گئیں اور نہایت مستعدی کے ساتھ انگریز کی وفاداری کا ایک ایک عمل بجالایا گیا۔ ان خدمات کے صلے میں شمس العلما کا خطاب پایا۔ نقد انعام، جاگیر اور ماہانہ وظیفہ پایا اور جب محسوس کیا کہ ان انعامات و اعزاز کے ساتھ دارالعلوم کا منصب اہتمام خطرے میں پڑجائے گا اور دارالعلوم کے خاموش ردعمل کا سامنا کرنا بھی مشکل ہوگا تو ریاست حیدرآباد (دکن) میں مفتی اعظم کے منصب پر فائز کردیے گئے۔ برٹش مفادات کے تحفظ کے تمام اعمال حضرت قاسم العلوم کے قائم کردہ دارالعلوم یا اس "نئے محاذ" میں انجام دیے جانے لگے جو حضرت نانوتوی نے جہاد شاملی کی ناکامی کی تلافی کے لیے قائم کیا تھا۔ اور یہ اعمال نہ صرف ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۵ء تک حضرت شیخ الہند کے زمانے میں انجام دیے گئے بلکہ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی کے دور تک انجام دیے جاتے رہے۔ دارالعلوم کو نہ صرف یہ کہ ملک کی آزادی کی جدوجہد سے الگ تھلگ رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی، بلکہ جدوجہد کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ اسیران مالٹا کی رہائی کی کوششوں میں ارباب اہتمام نے اپنے رویے سے بہت مایوس کیا۔ جب حریت پسند جماعتوں نے اسیران مالٹا کی رہائی کے لیے تحریک چلائی اور ڈاکٹر انصاری نے اپنے سیکریٹری عبدالعلی خاں (رام پوری) کو دارالعلوم کا تعاون حاصل کرنے اور میمورنڈم پر دستخط کرانے کے لیے بھیجا تو نہ صرف لیت و لعل سے کام لیا بلکہ ایک ہفتہ انتظار کرانے کے باوجود خان صاحب کو مایوس لوٹایا۔

اگرچہ کہا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں اربابِ اہتمام خود ایک وفد لے کر ہز آنر گورنر یوپی کے حضور میں باریاب ہوئے اور حضرت شیخ الہند اور آپ کے رفقاء کی رہائی کے لیے عرض پرداز ہوئے، لیکن اس وقت جب گورنر کا ایما اس سلسلے میں معلوم کرلیا تھا۔ پھر بھی کیا ان کی چاپلوس اور خوشامد پسند سیرتوں سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ انھوں نے حضرت اور آپ کے رفقا کی رہائی کا مطالبہ کیا ہوگا؟ خوشامد پسند زبانوں پر جو بات اس موقع پر آئی ہوگی وہ اس سے زیادہ نہ ہوگی کہ حضور! سیاسی جماعتیں، مذہبی انجمنیں، دینی ادارے، عوام، ہندو، مسلمان محمود حسن کی رہائی کا مطالبہ کررہے ہیں، صوبے کی لیجس لیٹو اسمبلی اور وائسرائے کی کونسل میں سوالات کیے جارہے ہیں، خود دارالعلوم میں بے چینی بڑھ رہی ہے اور حضور کے وفاداروں کی مشکلات میں اضافہ ہورہا ہے، اس لیے ان کی قید و نظر بندی پر حضور ہمدردانہ غور فرمائیں اور مراحم خسروانہ سے کام لے کر ان کو رہا فرمادیں۔ شاید یہ بھی کہا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جنگ میں عظیم برطانیہ کو فتح یاب فرمایا، ترکی کو اس کی خودسری کی سزا مل گئی، اس کے حصے بخرے ہوگئے، مختلف معاہدات میں اسے جکڑ دیا گیا ہے۔ جب ترکی کے کس بل نکل گئے ہیں تو اس کے حمایتی اور ہمدرد محمود حسن جیسے لوگ گریٹ برٹن ایمپائر کا کیا بگاڑ سکتے ہیں! حضور کے اقبال کے سامنے ان کی حیثیت ہی کیا ہے۔"

جیسا کہ عرض کیا، اگر یہ مسئلہ واقعی مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے عقیدے یا کسی علمی مسئلے میں ان کی رائے اور تحقیق کی غلطی کا ہوتا، تو اس کا راست اور بہترین طریقہ یہی تھا کہ حضرت شیخ الہند کے سامنے مسئلہ پیش کردیا جاتا، حضرت کا ایک اشارہ مولانا سندھی کے رجوع کے لیے کافی ہوتا۔ لیکن اربابِ اہتمام کو خود بھی یقین تھا کہ مسئلہ وہ نہیں جو وہ لوگوں میں مولانا سندھی کے خلاف اشتعال پھیلانے کے لیے بیان کرتے ہیں۔ انھیں یقیناً اندازہ ہوگا کہ

حضرت شیخ الہند کی رائے بھی مولانا سندھی کی رائے سے زیادہ مختلف نہ ہوگی، اس لیے اس مسئلے میں حضرت سے رجوع نہیں کیا گیا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے لکھا ہے کہ درس کے دوران میں اس مسئلے میں ایک سوال کے جواب میں حضرت نے ایک کافی و شافی تقریر فرمائی تھی اور سب مطمئن ہوگئے تھے۔ مولانا سندھی بھی حضرت کے ارشادات عالیہ سے یقیناً مطمئن ہو جاتے۔ لیکن معلوم ہے کہ ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ پھر جہاں روایت یہ ہو کہ دارالافتاء سے جاری ہونے والے فتووں پر شیخ الحدیث اور صدر المدرسین کے بھی دستخط ہوتے ہوں، وہاں دارالعلوم کے ایک فاضل اور خود صدر المدرسین اور شیخ الحدیث کے ایک شاگرد رشید کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا گیا تھا اور نامور استاد کو اس سے بالکل بے خبر رکھا گیا تھا۔ لیکن یہ سب تو تب ہوتا جب واقعی دارالعلوم کی بقا اور اس کے تحفظ کا یا کوئی علمی مسئلہ ہوتا، وہاں تو معاملہ ہی کچھ اور تھا اور طے کر لیا گیا تھا کہ عبید اللہ سندھی کو بہرصورت دیوبند سے نکالنا ہے۔ مولانا سید اسعد مدنی نے لکھا ہے:

> "اگر عقیدے اور دین کی بات ہوتی تو اس مباحثے میں حضرت شیخ الہند کو جو کہ شیخ الحدیث، استاذ الکل اور حضرت نانوتوی کے جانشین اور ان کی (علمی و فکری) امانتوں کے صحیح امین تھے، ضرور شریک کیا گیا ہوتا۔ ان کا ایک اشارہ مولانا سندھی کے رجوع کے لیے کافی ہوتا۔ مگر یہ علمی بحث و مباحثہ تو محض دکھانے کے لیے تھا۔ اصل سازش تو انگریز کی تھی۔"
>
> (ایک خود ساختہ داستان۔ حقائق کے آئینے میں، ص ۱۴، ۱۵)

اس سے آگے مولانا اسعد مدنی لکھتے ہیں:

> "سچی بات تو یہی ہے کہ مولانا سندھی کے ساتھ ارباب اہتمام نے جو کچھ کیا وہ اسی جرم بے گناہی کی سزا کے طور پر تھا، جس کا چسکا ان کے اندر خود حضرت شیخ الہند نے پیدا کیا تھا۔ یعنی

انگریز دشمنی، جسے ارباب اہتمام ایک لمحے کے لیے بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھے، لیکن براہ راست اس پر ایکشن لینے میں بہت سے خطرات تھے اور سب سے بڑا خطرہ تو خود حضرت شیخ الہند کی ذات گرامی تھی۔ اس لیے ایک علمی مسئلے کا شاخسانہ بظاہر کھڑا کر کے اس کی آڑ میں مظلوم حضرت سندھی کو ہٹایا گیا۔" (ایضاً ۱۵، ۱۶)

اگر مسئلہ واقعی مولانا سندھی کے کسی فاسد عقیدے اور دیوبند کے مسلک ومشرب سے انحراف اور اس کے ترک کا ہوتا، تو حضرت شیخ الہند سے مشورہ نہ کیے جانے کے باوجود حضرت کے علم میں یہ بات آئی تھی تو وہ مولانا سندھی سے خود بات کرتے، ان کے خیالات سے رجوع کرواتے، توبہ کرواتے اور اگر مولانا سندھی ایسا نہ کرتے تو حضرت شیخ الہند کی غیرت ایمانی یہ بات کب گوارا کرسکتی تھی کہ ایسے شخص سے وہ نصرت وحمایت اور مودت ومحبت کا تعلق رکھیں!

اس کے برعکس حضرت شیخ الہند کے رویے سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے مولانا سندھی سے نہیں بلکہ مولانا انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ سے جو مولانا سندھی سے اختلاف میں پیش پیش حضرات میں سے ایک تھے، بے زاری کا اظہار کیا تھا اور ان کی طرف سے اپنا رخ پھیر لیا تھا۔ مولانا اسعد مدنی لکھتے ہیں:

"اس کارروائی سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو کس قدر اذیت پہنچی تھی اور اس سے وہ کس درجہ متاثر ہوئے تھے۔ اس کا کچھ اندازہ اس واقعے سے ہوسکتا ہے کہ اس کارروائی کے عمل میں آنے کے بعد حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جن سے مولانا سندھی کی تکفیر کے فتوے پر دستخط لیا گیا تھا۔ حضرت شیخ الہند کی مجلس میں پہنچے تو حضرت نے ان کی جانب سے رخ پھیر لیا۔ بعد میں

منت سماجت کے بعد ان سے راضی ہوئے۔ اگر یہ کارروائی واقعی شرعی نقطہ نظر کے مطابق تھی اور دین کے ایک اہم تقاضے کو پورا کرنے کے لیے عمل میں لائی گئی تھی، تو اس سے حضرت شیخ الہند کی ناراضگی و ناگواری کی کیا توجیہ ہوگی؟" (ایضاً، ص ۱۶)

مولانا سندھی کا احتساب کرنے اور انھیں گرفت میں لانے کے لیے ایک "محکمہ احتساب" قائم کیا گیا تھا۔ لیکن یہ محکمہ دارالعلوم کے نظام کا کوئی حصہ نہ تھا، بلکہ مولانا شبیر احمد عثمانی نے قائم کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں شمس العلماء مولانا محمد احمد مہتمم دارالعلوم کا ایما ضرور شامل ہو گا۔ نائب مہتمم تو مولانا شبیر احمد عثمانی کے بڑے بھائی تھے ان کی اجازت و مشورہ سے یہ محکمہ قائم کیا گیا ہو گا۔ اور ان کے ایک بھائی دارالعلوم کے سب سے بڑے مفتی تھے، محکمہ احتساب کے قیام میں ان کے مشورے کو کیسے نظر انداز کر دیا گیا ہو گا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:

"دارالعلوم دیوبند میں ہمارے نہایت ممتاز اور نامور علما، جیسے علامہ انور شاہ کشمیری اور شیخ الاسلام شبیر احمد عثمانی نے اپنا ایک احتسابی محکمہ قائم کیا اور اس کے سامنے مولانا سندھی بحیثیت ایک ملزم کے پیش کیے گئے۔"

دارالشوریٰ میں جلسہ ہوا تقریر کرنے یا احتساب کرنے والوں میں مولانا انور شاہ کاشمیری، مولانا شبیر احمد عثمانی (دیوبندی) اور مولانا غلام رسول خاں (ہزاروی) استاد فلسفہ و منطق دارالعلوم تھے۔ حکم کی حیثیت سے ارباب اہتمام اور مفتی دارالعلوم، سامعین میں اساتذہ کرام اور تماشائیوں کی حیثیت میں دارالعلوم کے طلبہ موجود تھے۔ مسئلہ مختلفہ فیہا غیر مسلموں میں تبلیغ تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی لکھتے ہیں:۔

"مولانا عبید اللہ نے کھڑے ہو کر... یہ فرمایا کہ قرآن پاک کی آیہ شریف "لانذرکم بہ ومن بلغ" (تاکہ ڈراؤں میں تم کو جس

تک بات پہنچی) سے میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بنی آدم میں جن لوگوں تک قرآن کا پیغام نہیں پہنچا' ان سے اسلام کے قبول نہ کرنے کا مواخذہ نہ ہو گا۔"

تبلیغ کے باب میں مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا سندھی مرحوم کا ایک اور جملہ بھی نقل کیا ہے۔ وہ یہ کہ مولانا سندھی نے فرمایا:

"آج کل کے یورپین غیر مسلم لوگوں کی تبلیغ حق پوری نہیں ہوئی۔ اس لیے اگر ان کے اخلاق اچھے ہیں، تو وہ نجات کے مستحق ہیں۔"

مولانا سندھی مرحوم کے ان خیالات پر جو ردعمل ہوا، حضرت مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے بھی بیان فرمایا ہے۔ ہم یہاں تینوں بزرگوں کے ردعمل کو الگ الگ بیان کرتے ہین۔

۱۔ مولانا شبیر احمد عثمانی (دیوبندی):

"مولانا شبیر احمد عثمانی یہ سن کر غصے میں آگئے۔ انھوں نے اس خیال پر تنقید فرمائی۔ ان کی تقریر تو یاد نہیں رہی۔"

مولانا کی تقریر کے مطالب یاد نہ ہوں، تب بھی مضمون کا اندازہ کرلیا جاسکتا ہے۔

۲۔ مولانا غلام رسول خان (ہزاروی):

"ان (مولانا شبیر احمد عثمانی) کے بعد مولانا غلام رسول صاحب مرحوم نے تقریر فرمائی۔ جس سے ان کا یہ فقرہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی اگرچہ ہماری جماعت کے ایک فرد ہیں۔ لیکن (جس طرح) جب کوئی عضو سٹر جاتا ہے تو (اسے) کاٹ دیا جاتا ہے، اسی طرح یہ بھی اس جماعت سے الگ کر دیے گئے ہیں۔"

۳۔ علامہ انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں مولانا گیلانی مرحوم لکھتے ہیں:

"مولانا انور شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ ان کا یہ کلام سن کر بہت رنجیدہ خاطر ہوئے اور آگ بگولہ ہوکر یہ کہتے ہوئے ٹوٹ پڑے کہ آسمان اور زمین پر تبلیغ ہوچکی ہے۔ وہ کافر سب جہنمی ہیں۔ اگر تیرا ایسی عقیدہ ہے تو تیرا مقام بھی جہنم ہی ہے۔"

اسی سلسلہ بیان میں مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

"مدرسہ کے مہتمم اور نائب مہتمم کو بھڑکایا کہ عبید اللہ کا عقیدہ فاسد اور کافرانہ ہے۔ کہتا ہے کہ موجودہ کفار نجات کے مستحق ہیں اور عام مولوی اور طلبہ کا جلسہ بلاکر مولانا سندھی کو بھی بلایا اور کہا کہ تم نے کفر کا کلمہ کہا ہے۔ اب توبہ کرکے ایمان کی تجدید کرو۔ مولانا سندھی نے دیکھا کہ جماعت برافروختہ ہے تو آپ نے فرمایا کہ اگر یوں ہی ہے، تو میں آمنت باللہ پڑھ دیتا ہوں اور ساتھ ہی کلمہ شہادت بھی پڑھ کر سنایا۔"

محکمہ احتساب کی جو کارروائی ہمارے سامنے ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ احتساب کے لیے ایسا دن مقرر کیا گیا تھا کہ حضرت شیخ الہند دیوبند میں موجود نہ ہوں۔ اب اس کارروائی پر ایک نظر ڈالیے تو فوراً محسوس ہوجاتا ہے کہ

۱۔ یہ جلسہ احتساب نہ تھا بلکہ "جلسہ اعلان فیصلہ" تھا۔ فیصلہ پہلے ہی کر لیا گیا تھا۔ اب دارالعلوم میں مولانا سندھی کے خلاف عام فضا پیدا کرنے کے لیے یہ ڈراما کھیلا گیا تھا۔

۲۔ مولانا سندھی مرحوم نے توبہ کی، ایمان کی تجدید کی اور کلمہ شہادت پڑھا۔ لیکن فیصلہ پھر بھی ان کے خلاف کردیا گیا۔ اور خواہ زبان سے نہ کہا ہو، لیکن عمل سے یہی ثابت کیا کہ ان کا تجدید ایمان اور "**اقرار باللسان**" محض دباؤ کے تحت ہے۔ اسے "**اقرار بالقلب**" قرار نہیں دیا جاسکتا۔ مولانا سندھی کو کافر قرار دے دیا گیا، منصفین نے فیصلے پر صاد کیا اور دارالافتاء کی مہر سے لے

مصوب و موثق کر دیا گیا۔
۳۔ اور جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے کہ احتساب کے لیے ایسا دن مقرر کیا گیا کہ حضرت شیخ الہند دیوبند میں موجود نہ ہوں۔ چناں چہ جوں ہی ایک روز معلوم ہوا کہ حضرت گنگوہ تشریف لے گئے ہیں۔ فوراً جلسہ بلایا گیا۔ اور طے شدہ منصوبے کے مطابق مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ انگریزی عدالتوں کے فیصلے کی طرح بہ قول رشید احمد صدیقی ''شیطان حق پر اور فرشتہ ناحق پر تھا۔''

مولانا سندھی نے اندازہ کیا کہ اس ماحول میں وہ جمعیت الانصار کے کام کو جاری نہیں رکھ سکیں گے۔ چناں چہ انھوں نے جمعیت کی نظامت سے استعفا دے دیا۔ استعفے کی عبارت سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اختلاف دور نہیں ہوا تھا اور مولانا سندھی کی توبہ قبول نہیں ہوئی تھی۔ مولانا سندھی کا یہ استعفا یا تاریخی خط جو انھوں نے جمعیت کے صدر مولانا حبیب الرحمان عثمانی نائب مہتمم کو لکھا تھا، اس کی ابتدائی سطریں یہ ہیں۔:

> ''معروض آں کہ جلسہ انتظامیہ کے تمام ممبر جہاں تک مجھے معلوم ہوا ہے، میری نسبت اچھے خیالات نہیں رکھتے۔ اگر جامعۃ القاسمیہ تک معاملات کا مرافعہ کیا جاوے اور میں اپنی برات ثابت کر لوں، تو بھی اتفاق سے کام چلانا مشکل ہے۔ لہٰذا جمعیت الانصار کی خدمت سے استعفا پیش کرتا ہوں۔''

مولانا سندھی کا یہ خط ۱۱ر مئی ۱۹۱۳ء کا یادگار ہے۔

تبلیغ کا مسئلہ جو کچھ اور جیسا کچھ بھی تھا، مولانا گیلانی کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ محکمہ احتساب کی کارروائی اور فیصلے کے بعد بھی ذہن صاف اور قلب مطمئن نہیں ہوئے تھے۔ مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> ''مجلس (یعنی جلسہ احتساب) برخاست ہو گئی لیکن اس سے میرا دل بے حد متاثر تھا۔ غالباً دوسرے دن یا ایک دو دن بعد جب حضرت شیخ الہند کے درس میں ترمذی شریف کا دورہ شروع تھا

تو اس فقیر نے بہ جرات رندانہ یہ مسئلہ دہرایا کہ اس وقت جو تبلیغ کے باب میں اختلاف سا ہو گیا ہے حضور والاشان اس کی بابت کیا ارشاد فرماتے ہیں؟.....بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کے جلسوں کی تقریروں کی خبریں حضور تک بھی پہنچی تھیں، جن سے وہ متاثر تھے۔"

مولانا مناظر احسن مرحوم لکھتے ہیں:

"آپ نے ایک ایسی "شستہ و رفتہ تقریر" میں یہ مسئلہ بیان فرمایا جو بندے کی نزدیک "حرف آخر" کی حیثیت رکھتا ہے۔"

آپ کی اس تقریر کے آخری الفاظ یہ ہیں:

"الغرض انفرادی طور پر یہ بات کہ تبلیغ کس کو کس درجے کی ہوئی ہے حق تعالیٰ سبحانہ ہی اسے جانتے ہیں اور مواخذہ بھی وہی اپنے علم کے مطابق کریں گے ... اشخاص کو متعین کر کے یہ بتانا آدمی کے لیے ناممکن ہے کہ کس کو کس درجے کی تبلیغ ہوئی اور جب تبلیغ کے مدارج کا تفصیلی علم نہیں ہو سکتا تو مواخذہ کی تفصیل بھی ہم کیسے کر سکتے ہیں۔"

مولانا گیلانی کے بقول "حضرت شیخ کی اس تقریر پر کافی شور و غوغا ہوا اور اس سے جو غلط فہمی پھیلنے کا اندیشہ تھا' اس کے ازالے کے لیے ایک جلسہ بھی طلب کیا گیا۔ اس بیان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ

۱۔ حضرت شیخ الہند کی رائے مولانا سندھی کی رائے کے موافق تھی یا کم از کم اس کے خلاف ہرگز نہ تھی اور یہ کہ حضرت شیخ الہند ارباب اہتمام اور ان کی حواریوں کی رائے اور رویے سے ہرگز متفق نہ تھے۔

۲۔ اس بات کا یقین حضرت کے اس رویے سے بخوبی ہو جاتا ہے، جس کا اظہار حضرت نے مولانا انور شاہ کاشمیری سے ناراضگی کی صورت میں کیا تھا اور مولانا اسعد مدنی کے حوالے سے اسی مضمون کی گذشتہ سطروں میں آچکا

ہے۔
۳۔ اس کے بعد خود علامہ کاشمیری کا احساس ندامت اور معذرت وعفو خواہی نے تو صاف صاف اس بات کا اعلان کر دیا کہ یہ محض ایک ڈراما تھا جو ارباب اہتمام اور عثمانی خاندان کے بعض افراد کے اشارے پر کھیلا گیا تھا اور حضرت علامہ کاشمیری محض غلط فہمی کا شکار ہو گئے تھے۔
۴۔ پھر اس فتوی کو "فتاویٰ دارالعلوم" میں شامل نہ کرنا خود اس بات کا غماز ہے کہ فتویٰ غلط تھا، اس طرح خود دارالعلوم کے ارباب بست وکشاد اور اصحاب علم کے رویے سے مولانا سندھی مرحوم کی بریت اور ان کا حق پر ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

۵۔ اور بعد میں تاریخ دارالعلوم میں انھیں نامور فرزندان دارالعلوم میں شامل کرنا اور ان کے مبینہ ومعروضہ عقائد باطلہ کا ادنیٰ ذکر نہ کرنا بھی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ڈرامے کا وقت گزر گیا ہے، اس لیے چہرے سے میک اپ کو صاف کر لینا چاہیے۔

اب اگر مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی تضلیل وتکفیر اور انھیں دیوبند سے نکلوانے کا پس منظر تبلیغ کے باب میں ان کے خیالات وعقائد نہیں تھے تو حقیقت کیا تھی؟ اس مسئلے پر کتاب کے باب چہارم میں روشنی ڈالی جائے گی
اس سلسلے میں دارالعلوم میں جو کارروائی بھی ہوئی تھی وہ ارباب اہتمام کے ایما سے اور عین ان کی مرضی کے مطابق عمل میں آئی تھی لیکن وہ اب بھی مطمئن نہ تھے۔ چنانچہ مولانا حبیب الرحمان عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم نے ایک روز مولانا مناظر احسن گیلانی کو جو اس زمانے میں دارالعلوم میں زیر تعلیم تھے بلایا اور

ان سے کہا (۱):

"تم حضرت سے مل کر معلوم کرو کہ واقعی سیاسیات میں حضرت والا کا صحیح مسلک کیا ہے؟"

چنانچہ مولانا گیلانی حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور دریافت فرمایا۔ وہ لکھتے ہیں:

"یہ پیغام سنتے ہی میں نے دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے۔ اور ارشاد فرمایا "حضرت الاستاذ ﷺ (حضرت نانوتوی) نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس اور تعلیم و تعلم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ناکامی کے بعد یہ ادارہ قائم کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔

صرف تعلیم و تعلم اور درس و تدریس ہی جن کا مقصد اور نصب العین ہے، میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں لیکن اپنے لیے تو اسی راہ کا انتخاب میں نے کیا ہے، جس کے لیے دارالعلوم کا یہ نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا۔" (سوانح قاسمی، جلد 2، صفحہ ۲۲۶)

مولانا گیلانی مرحوم نے بھی اس بات کو "دارالعلوم کی اساسی خصوصیت" تسلیم کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"مدرسہ دیوبند کی یہی وہ اساسی خصوصیت" تھی جس

---

(۱) مولانا حبیب الرحمن اور حضرت شیخ الہند کا صبح سے شام تک کئی بار آمنا سامنا ہوتا تھا اور دارالعلوم میں ملاقات ہونا معمول کا حصہ تھا لیکن یہ ان کی چالاکی تھی کہ خود سامنے نہیں آئے۔ مولانا سندھی سے مقابلے کے لیے مولانا انور شاہ کشمیری اور مولانا غلام رسول خاں کو بھڑا دیا اور حضرت شیخ الہند سے کچھ معلوم کرنا چاہا تو مولانا مناظر احسن کو استعمال کیا۔ لیکن تاریخ کا فیصلہ ان کے خلاف ہوا اور سب کی پول کھل گئی (ا۔ س۔ ش)۔

نے اس مدرسے کے تمام کاروبار حتی کہ تعلیم میں بھی ایسی ہی حریت پرور خصوصیات پیدا کیں اور وہ دینی اور مذہبی حمیت وغیرت کا ہندگیر ہی نہیں عالم گیر جامعہ اور اقامتی ادارہ بن گیا۔ اس کے فضلا کا ایک خاص مکتب خیال نمایاں ہوا اور اس کے مستفیدین ایک ایسا خاص ملا جلا اور مرکب نصب العین لے کر باہر نکلے، جس میں سب پر چھا جانے کی اسپرٹ موجود تھی۔ ظاہر ہے کہ "یہ اساسی خصوصیت" حضرت والا کے سوا کسی کے سامنے نہ تھی۔ اور نہ ہی ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جو اس وقت سامنے تھے، ہر ایک سے اتنی بلند نظری کی توقع ہی کی جاسکتی تھی۔"

(ایضاً، ص ۲۷-۲۲۶)

اسی سلسلے میں مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

"اسی کے بعد دو راہیں مختلف ہوگئیں۔ ایک راہ تعلیم و تعلم و دینی نشرواشاعت کی اور دوسری راہ وہی جسے بالآخر حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار فرمایا۔ اور اسی مسلک کے ساتھ اپنے مالک سے جاملے۔

خیال آتا ہے کہ حضرت نے یہ بھی فرمایا تھا کہ فرائض الٰہیہ جس قدر بن پڑا، ادا کرتا رہا، اب آخری کام یہی رہ گیا ہے، جسے اپنی حد تک تو میں کر گزروں گا اور اسی کو وہ کر گزرے۔

خاکسار نے جو کچھ سنا تھا، وہی ان لوگوں تک پہنچا دیا، جنھوں نے اپنا پیغام دے کر بھیجا تھا۔" (احاطہ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن، دارالعلوم، بابت ماہ جمادی الثانی ۱۳۷۲ھ، صفحہ ۴۲)

اب تو "تاریخ دارالعلوم" کے مقدمہ میں مولانا قاری محمد طیب مرحوم نے مولانا گیلانی کی اس روایت کا حوالہ دے کر دارالعلوم کے نصب العین کی جامعیت اور مقاصد کی ہمہ گیری کے اس پہلو کو تسلیم کرلیا ہے اور

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ اور آپ کے شاگرد رشید امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی سیاسی خدمات کا اعتراف بھی کیا ہے۔

استدراک:

یہ بحث نہ صرف اختتام کو پہنچ چکی تھی بلکہ الولی (حیدر آباد) سندھ میں شائع بھی ہو چکی تھی کہ مولانا اخلاق حسین قاسمی کی تالیف "محاسن موضح قرآن" نظر سے گزری۔ مولانا موصوف نے شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے حوالے سے ٹھیک وہی بات لکھی ہے جس کی مولانا سندھی سے نسبت پر ان کے خلاف کفر کا فتویٰ لگایا گیا تھا ترجمہ شاہ عبد القادر دہلوی کے اسباب و محرکات کے سلسلے میں مولانا قاسمی لکھتے ہیں:

"شاہ عبد القادر صاحب کے والد محترم اپنی مشہور کتاب "حجتہ اللہ البالغہ میں یہ تحریر کر چکے تھے کہ "کسی غیر مسلم قوم پر دین حق کی تبلیغ اتمام حجت کی حد تک کرنا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اس قوم کی زبان میں اسلامی اصول پیش کیے جائیں تاکہ وہ سمجھیں۔

اگر اس درجہ ابلاغ دین نہ ہو گا تو وہ قوم "اصحاب الاعراف" کی حیثیت میں ہوگی۔" (حجتہ اللہ البالغہ' باب طبقات الامت۔ جلد اول' مصری صفحہ ۱۱۷)

بڑے بھائی حضرت شاہ عبد العزیز صاحب نے اپنی فتاویٰ میں بھی اس مسئلے پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ "مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر قوم کو اس کی زبان میں خدا کا پیغام سمجھائیں اور زبانی اور تحریری افہام و تفہیم کے ساتھ ساتھ اپنے اخلاق حسنہ کو بطور دلیل کے ان کے سامنے پیش کریں اور اس طرح کفر و اسلام کے درمیان امتیاز قائم کر کے دکھائیں۔

اور اگر کسی قوم پر اس طرح اتمام حجت نہ ہو گا تو وہ قوم

اصحاب فترت کہلائے گی "حکم او حکم اہل فترت بود علی اختلاف المذاہب۔" (فتاوی عزیزی، ص ۱۴۰) (محاسن موضح قرآن، ص ۷۸، ۷۹)

مولانا قاسمی صاحب کی اس تحریر سے حجتہ اللہ البالغہ اور فتاویٰ عزیزی سے رجوع کی تحریک ہوئی۔ حجتہ اللہ البالغہ سامنے تھی اسے دیکھا تو ٹھیک یہی بات نکلی حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں۔:

"اصحاب الیمین کے بعد ان لوگوں کا درجہ ہے جن کو اصحاب الاعراف کہتے ہیں۔ ان کی بھی دو قسمیں ہیں:

ایک قسم کے تو وہ لوگ ہیں جن کے مزاج صحیح اور فطرت پاکیزہ ہے اور ان کو دعوت اسلام کی کچھ خبر نہیں ہوئی ہے یا خبر تو ہوئی ہے لیکن اس طرح سے کہ وہ ان پر حجت نہ بن سکی اور نہ ہی اس سے ان کے دلوں کا شبہ دور ہو سکا اس واسطے ان لوگوں کو خسیس ملکات اور برے اعمال میں نہ تو انہماک ہوتا ہے اور نہ ہی جناب حق کی طرف ان کی توجہ ہوتی ہے نہ اثباتاً اور نہ نفیاً" ، یہ لوگ اپنے اکثر حالات میں دنیوی کاروبار میں مشغول رہتے ہیں۔ پس یہ لوگ جب مریں گے تو ایک کورانہ حالت کی طرف رجوع کریں گے۔ نہ ان کو عذاب ہو گا اور نہ ثواب۔ یہاں تک کہ ان کی بہیمیت محو ہو جائے اور پھر ملکی قوت کی بجلیوں میں سے کچھ ان پر چمکیں گی اور

دوسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن میں عقلی مادہ کم ہے، جیسے اکثر لڑکے "دیوانے" کاشتکار اور غلام اور اکثر و بیشتر ان کے متعلق لوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کو کوئی خوف نہیں اور جب رسوم کی پابندی ان میں نہ ہو تو خود محض بے عقل رہ جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے مومن ہونے کے لیے اتنا ہی کافی ہے جتنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سیاہ لونڈی کے لیے کافی سمجھا تھا۔ اس سے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا، خدا کہاں ہے؟

اس نے آسمان کی جانب اشارہ کیا۔ ایسے لوگوں سے یہی مقصود ہوتا ہے کہ مسلمانوں سے مشابہ رہیں تاکہ کلمہ کی تفریق نہ ہو۔"

اسی دوران میں مولانا سندھی کی تالیف "رسالہ محمودیہ" نظر سے گزری، یہی بلت اور تقریبا انھی لفظوں میں انھوں نے بدور بازغہ کے حوالے سے لکھی ہے۔

"جو لوگ مرنے کے بعد اعراف میں جائیں گے وہ کئی قسم کے ہیں:

(الف) وہ لوگ جن کو دعوت حق پہنچی ہی نہیں، مثلاً دور دراز بلند پہاڑوں میں بسنے والے لوگ بشرطے کہ انھوں نے خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیرایا ہو، نہ خدا تعالیٰ کی ہستی کا انکار کیا ہو، اور نہ کسی نبی کی امت میں باقاعدہ شامل ہوئے ہوں۔ ان کی حالت حیوانات کی مانند ہے کہ وہ خدا کی توجہ طرف نہیں کر سکتے، نہ اقرار کرنے کی شکل میں نہ انکار کرنے کی شکل میں۔ وہ صرف معاشی زندگی بسر کرنے کی کوشش کرتے ہیں یہ لوگ اعراف میں جائیں گے۔

(ب) یا ان کو پیام حق پہنچا لیکن وہ پیام ان کی جہالت کو دور نہ کر سکا۔ مثلاً وہ لوگ جن کو اسلام ایسی زبان میں پہنچا جسے وہ سمجھ نہیں سکتے یا اس کی دلیلوں کو نہیں سمجھ سکتے ...... یا ان کی ذہنی تربیت ایسی ہوئی ہے کہ وہ دقت نظر سے کام ہی نہیں لے سکتے۔ ان کا مبلغ علم اتنا ہی ہے کہ مسلمان ایک قوم ہیں جن کی پگڑیاں ایسی ہوتی ہیں، جن کے کرتے ایسے ہوتے ہیں وہ فلاں فلاں چیزیں کھاتے ہیں اور فلاں فلاں نہیں کھاتے یا وہ ایک قوم سے ہیں جن کی ہمارے ساتھ ملکی جنگیں ہوتی ہیں اس لیے ہمیں بھی ان سے لڑنا پڑتا ہے۔ ان سب باتوں کے ساتھ ان میں یہ بات بھی ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھیراتے۔ ان کی عام حالت حیوانوں

کی سی ہوتی ہے۔ گو ان کا مزاج فی الجملہ صحیح ہوتا ہے۔

(ج) وہ لوگ جن کی عقلیں ناقص ہیں۔ مثلاً بچے، پاگل، کم عقل، بے وقوف دہقان اور غلام جو حق و باطل میں تمیز نہیں کرسکتے اور وہ تقریباً نہ رب کو پہچان سکتے ہیں، نہ اس کی عبادت کرسکتے ہیں۔ ان کی ذہنی حالت پانی کی طرح ہے جو اپنی کمزوری (سیلان) کی وجہ سے کوئی نقش قبول ہی نہیں کرتا۔ ان لوگوں سے صرف اتنی توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ مشابہت پیدا کریں۔"

اب جن حضرات کو مزید تحقیق مقصود ہو وہ حجتہ اللہ البالغہ، البدور بازغہ اور فتاوی عزیزی سے رجوع کرسکتے ہیں۔ ہمارے سامنے مولانا سندھی کی تحریر یا تقریر نہیں۔ معلوم نہیں انھوں نے کسی موقع پر اور کس سیاق و سباق میں اور کن لفظوں میں خیال کا اظہار کیا ہوگا، لیکن یقین ہے کہ جو کچھ کہا ہوگا وہ امام ولی اللہ دہلوی کے دائرہ فکر سے باہر نہ ہوگا اور اسی لیے ان کے استاد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ کا جو بیان مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم نے نقل کیا ہے، اس سے مولانا سندھی کے فکر و خیال کی تائید و توثیق کا پہلو نکلتا ہے تردید کا نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب والحق

اسی سلسلے میں کسی جگہ مولانا ابوالکلام آزاد کا بیان یا ان سے متعلق روایت نظر سے گزری ہے مولانا کو اس جھگڑے کی خبر ہوئی تو انھوں نے فرمایا "بات وہی ہے جو مولوی عبید اللہ نے کہی لیکن اسے چھیڑنے کا وہ موقع نہ تھا ان کا کام دوسرا تھا" لیکن جو صورت حال اور واقعی پس منظر سامنے آچکا ہے اس سے صاف معلوم ہوجاتا ہے کہ اگر مولانا سندھی اس بات کو نہ چھیڑتے تو انھیں نکالنے کا کوئی اور بہانہ تلاش کرلیا جاتا۔

(۲)
ہندو مسلم اتحاد

دوسرا مسئلہ جو مولانا عبید اللہ مرحوم کے خلاف الزامات کی فہرست میں نظر آتا ہے اور ان کے خلاف ہنگامے، ان کی تضلیل و تکفیر اور دیوبند سے ان کے اخراج کا سبب بنا "ہندو مسلم اتحاد" کے بارے میں ان کے مساعی تھے۔

ہندو مسلم اتحاد ہندوستان میں ایک اہم مسئلہ رہا ہے۔ اس مسئلے کے دو پہلو ہیں :

۱۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ملک کی آزادی کے لیے اور ۱۹۴۷ء کے بعد ملک کی عمومی تعمیر و ترقی کے لیے ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اہمیت

۲۔ عام معاشرتی، سماجی اور تمدنی زندگی میں ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت اور اس کی اہمیت،

انگریزوں نے اپنے اقتدار کے قصر عالی شان کی بنیاد "لڑاؤ اور حکومت کرو" کے اصول پر رکھی تھی۔ اس مقصد کے لیے اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑایا اور اس کے لیے اس نے تاریخی، سماجی، تمدنی، تہذیبی اور مذہبی اختلافات کو ہوا دی، نزاعات کو بڑھایا اور ہندوستان کی سماجی زندگی میں دو حلیف قوموں کے بجائے دو مخالف اور متحارب قوموں کی تعمیر و تشکیل اور تنظیم کے لیے ہر حربہ استعمال کیا۔ ہندوؤں اور ہندوؤں میں اختلافات و نزاعات پیدا کیے۔ مسلمانوں مسلمانوں کو ایک دوسرے سے لڑایا اور کمزور سیرت کے بعض علما سے کام لے کر علمی و فکری مسائل کو عوام میں اچھال کر انتشار پیدا کیا اور ایک مکتبہ فکر اور فرقے کو دوسرے کے خلاف منظم و مستحکم کیا۔ مختلف فرقوں اور سماجی

طبقات کو ایک دوسرے سے لڑایا اور اس کے نتیجے میں جو حالات پیدا ہوئے، ان سے اپنی حکومت کے استحکام اور اقتدار کو دوام بخشنے کا کام لیا۔

ہمارے بزرگوں نے شروع ہی سے انگریزوں کی اس ڈپلومیسی کو سمجھ لیا تھا اور وہ غور وفکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ انگریزوں کے اقتدار سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہر سطح پر اتحاد واتفاق کی ضرورت ہے۔ اس کے لیے انھوں نے سعی کی۔

انیسویں صدی کے آغاز میں جب سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل شہید نے تحریک جہاد اور احیاے حکومت اسلامی وقومی کا آغاز کیا تو اس میں ہندوؤں کے تعاون کی ضرورت کا احساس اسی شعوری فیصلے کا نتیجہ تھا اور پھر ۱۸۵۷ء میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر آزادی کی جنگ لڑنا اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ اور جب حضرت شیخ الہند نے اس وادی میں قدم رکھا تو انھیں پہلے دن سے احساس تھا کہ ملک کی آزادی کا خواب ہرگز شرمندہ تعبیر نہیں ہوسکتا، جب تک ملک کی مختلف اقوام کے اختلافات کو اتحاد سے بدل نہیں دیا جاتا۔ حضرت شیخ الہند کے بعد شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی اور دیوبند کے انقلابیوں اور ملک کے تمام مسلمان حریت پسندوں، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبید اللہ سندھی کی سیاست کی بنیاد بھی اس اصول پر قائم تھی کہ ہندو مسلم اختلافات پیدا کرکے ملک کی تیسری قوت کو مستحکم ہونے کا موقع نہیں دینا چاہیے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس اصول سیاست کی بنیاد حکیم الہند شاہ ولی اللہ دہلوی کے فلسفہ عمرانیات میں تلاش کرنی چاہیے۔ اسلام کے اس عظیم فلسفی نے پہلی بار معاشرے کی تشکیل کے اصولوں پر مسلم اور غیر مسلم نقطۂ نظر کے بجاے انسانی نقطۂ نظر سے بحث کی ہے اور بتایا کہ ایک اچھی معاشرتی زندگی جس

میں اس کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے بعد ہر شخص کو اتنا وقت ملے کہ وہ اپنے بچوں کی بہترین تعلیم و تربیت کے ساتھ اپنی روحانی ترقی کے لیے بھی وقت نکال سکے، یہ ہر انسان کا حق ہے، نہ کہ کسی خاص قوم مسلمان یا غیر مسلمان کا! انسانیت کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ رفاہیت ناقصہ اور رفاہیت بالغہ کی جگہ رفاہیت متوسطہ کو پیدا کیا جائے۔ یہ بات انھوں نے بتائی کہ جس طرح رفاہیت ناقصہ حیوانی زندگی کو جنم دیتی ہے، اسی طرح رفاہیت بالغہ غیر اخلاقی زندگی کا سرچشمہ بنتی ہے اور اس کے مہلکات نہ صرف مسلمانوں کی اخلاقیات کی تاراجی کا باعث ہوتے ہیں، بلکہ پورا معاشرہ ان انسانی اقدار سے محروم ہو جاتا ہے، جس کے بعد انسانی معاشرے کی تاراجی کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔

ہندوستان میں صدیوں سے بادشاہی اور جاگیردارانہ نظام نے مسلمانوں میں اخلاق و سیرت کی جو خرابیاں پیدا کر دی تھیں اور غیر مسلموں کے امرا کے سوا ہندوستان کے عوام رفاہیت ناقصہ میں مبتلا ہو کر حیوانی زندگی کی اس سطح تک پہنچ گئے تھے کہ ان میں انسانی، اخلاقی اور تہذیبی زندگی کی کوئی قدر باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ ایک قوت تھے، لیکن امرائے قوم کے ہاتھ میں محض ایک آلے کی حیثیت رکھتے تھے۔ امرا انھیں اپنے مفاد اور مقاصد کے لیے استعمال کرتے تھے۔ خود انھیں اس سے کوئی غرض نہ تھی کہ انھیں کہاں اور کن مقاصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ انہیں اچھے، برے، غلط اور صحیح سے کوئی سروکار نہ ہوتا تھا۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا، جسے امرا اپنے مفاد اور اغراض کے لیے استعمال کرتے تھے اور پھر ان کے پرسان حال نہ ہوتے تھے۔ ان کی ضروریات انھیں مجبور کرتی تھیں کہ دوسری بار وہ اپنے پہلے مفتوح کے جھنڈے کے نیچے پہلے فاتح کے خلاف لڑیں اور اسے فتح دلا دیں۔ جنگ کے جواز و عدم جواز یا حق اور ناحق سے انھیں کوئی غرض نہ ہوتی تھی۔ کل

انسانی مفادات کا تصور تو دور کی بات تھی، انھیں مسلمانوں کے اجتماعی مفادات سے بھی کوئی غرض نہ ہوتی تھی۔ وہ خود سوچنے اور فیصلہ کرنے کے حق سے گویا دست بردار ہو گئے تھے۔

حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اب ہندوستان میں سیاسی انقلاب ناگزیر ہو گیا ہے اور اصول انقلاب کے مطابق معاشرتی انقلاب بھی اس کا لازمہ ہے۔ ضروری ہے کہ آیندہ ملک کے حالات بدل جائیں اور امیروں اور جاگیرداروں کا طبقہ ذلیل و خوار ہو جائے اور "اذلہ" میں شمار ہونے لگے اور معاشرے کے نچلے ہوئے طبقات معاشرے کے اوپر کی سطح پر آکر صاحب عزت "اعزہ" بن جائیں۔ شاہ ولی اللہ کی بصیرت نے انھیں بتا دیا تھا کہ ملک کی موجودہ سوسائٹی کی تباہی لازمی ہے۔ اب محض تجدید و احیا کی کوئی سعی مشکور نہ ہو گی۔ اس لیے انھوں نے "فک کل نظام" کی دعوت دی۔ بلا شبہ انسانی اصولوں، ایک نئے معاشرے یا جدید ہندوستان کی تعمیر کے اصول و اقدار کی طرف ان کی "مومنانہ فراست" اور اسلامی تعلیمات میں ان کی مجتہدانہ بصیرت نے رہنمائی کی تھی اور ان کے اصول 'واقدار انسانی اور اسلامی فلسفہ و اخلاقیات میں کوئی تعارض نہ تھا لیکن ان کے تدبر و بصیرت نے ان پر اس حقیقت کا انکشاف بھی کر دیا تھا کہ ملک کے آئندہ سیاسی و معاشرتی نظام کی شکل شاید وہ نہ ہو جو ماضی میں رہ چکی ہے اور جسے مسلمانوں کی نظریں "اسلامی" سمجھنے میں دھوکا کھاتی رہی ہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی ؒ ہندوستان کے پہلے فلسفی اور حکیم ہیں جنھوں نے معاشرے کی ایسی انسانی اور اخلاقی تنظیم کی طرف توجہ دلائی جس کے افراد انسان ہوں، نہ کہ مسلمان یا غیر مسلمان۔

دیوبند کے انقلابی بزرگ اس حقیقت کے سب سے زیادہ آشنا تھے۔

اس لیے انھوں نے شروع ہی میں ملک کی سیاسی و سماجی زندگی میں مسلمان اور غیر مسلمان کی تفریق کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں کی دینی تہذیبی اور اجتماعی زندگی اور مفادات کے کسی ادنیٰ جزء کو بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہو سکے جس کا نقصان ملک کی سماجی زندگی کو اور فائدہ ملک پر قابض تیسری قوت کو پہنچے۔

ممکن ہے کہ ان کے اندازِ فکر میں کسی مقام پر کوئی خامی رہ گئی ہو لیکن نہ صرف ان کا، ان کے بزرگوں کا بھی طرزِ عمل یہی رہا تھا اور وہ اپنے اس انداز فکر اور فیصلے میں مخلص تھے۔ ہندوستان کے غیر مسلموں سے اتحاد محض ایک سیاسی ضرورت ہی نہ تھی بلکہ مسلمانوں کے بہترین اجتماعی، ملی اور ان کے اقتصادی مفادات کا تقاضہ بھی یہی تھا اور تبلیغ و اشاعت اسلام کے لیے بھی ضروری تھا کہ غیر مسلموں سے اختلافات، تنازعات کے بجائے اتحاد اور ملک میں فتنہ و فساد کے بجائے ہر طرف امن و امان ہو۔

اتحاد اور امن و امان ہی کی صورت میں مسلمان اپنے کاروبار کو پھیلا سکتے تھے، زراعت کو ترقی دے سکتے تھے، وسائل معاش کی تگ و دو میں حصہ لے سکتے تھے اور اپنی اقتصادیات کو درست کرنے کی سعی کر سکتے تھے۔ اسی پر ان کی ملی، معاشرتی، تہذیبی، تعلیمی سرگرمیوں کا دارومدار تھا۔ امن و اتحاد کو بغیر وہ تمدنی زندگی کی راحتوں، پرسکون زندگی کی لذتوں اور گھریلو زندگی کی مسرتوں سے بھی لطف اندوز نہیں ہو سکتے تھے۔ اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے بہترین مواقع کا مہیا ہونا بھی اسی صورت میں مہیا ہو سکتا تھا۔

ہندو اور مسلمان اس ملک میں صدیوں سے رہتے آرہے تھے۔ ان میں ہزاروں بار اختلافات ہوئے اور جنگ و جدل کی نوبت بھی آئی تھی۔ آیندہ بھی ان امکانات کو رد نہیں کیا جاسکتا، لیکن ہمیشہ کے لیے اختلاف و انتشار اور

فساد اور جنگ و جدل کی صورت کو گوارا نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ بات نہ مسلمانوں کے مفاد میں تھی، نہ ہندوؤں کے فائدے میں۔ امن و اتحاد ماضی میں بھی ان کی ضرورت تھی، حال میں بھی ان کا فائدہ اسی میں ہے اور مستقبل میں بھی وہ امن و اتحاد کی ضرورت سے بے نیاز نہیں ہوسکے۔ مسلمانوں کی دینی اور دنیاوی، دونوں طرح کی فلاح اور بہبود کا راستہ امن و اتحاد کی فضا ہی میں طے کیا جاسکتا ہے۔ ہندوستان میں مسلمان اپنی دنیاوی زندگی کے کسی اور پہلو سے شاید صرف نظر کرسکیں، لیکن امن و اتحاد کی ضرورت کے کبھی منکر نہیں ہوسکتے۔

لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ بیسویں صدی کے ہندوستان میں بھی کچھ ایسے ہندو ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کو طاقت کے ذریعے ختم کرسکتے ہیں اور ایسے مسلمان بھی موجود ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوؤں کو غلام بنایا جاسکتا ہے۔ حالاں کہ اب نہ ان کے پاس حکومت ہے، نہ اقتدار، نہ اقتصادی و معاشی استحکام انھیں حاصل ہے۔ ان کی اجتماعی زندگی کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ حتیٰ کہ اب وہ اخلاقی قوت، دین داری اور علم و تقویٰ کی بہترین انسانی صفات سے بھی عاری ہوگئے ہیں۔

اس کے باوجود اگر کوئی مسلمان یا مسلمانوں کی کوئی جماعت یہ سمجھتی ہے کہ وہ ایسا کرسکتی ہے تو اس کی عزائم کی بلندی کو خراج تحسین کیا جاسکتا ہے۔ لیکن عملی دنیا میں ان آرزوؤں کی کیا حیثیت ہے؟ یہ سوچنے کی بات ہے!

بہ ہر صورت حالات یہ تھے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا تھا، جو اپنی ناسمجھی سے مذہبی جوش میں دونوں قوموں کے مابین اختلافات کو ہوا دے رہا تھا، فتنہ و فساد پھیلا رہا تھا، برٹش ڈپلومیسی کا آلۂ کار بنا ہوا تھا اور نہایت شرم ناک بات یہ تھی کہ اس کے لیے مذہب کے نام کو استعمال کیا جارہا تھا۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے حضرت شیخ الہند کی ہدایت کے مطابق مولانا محمد علی کے تعاون سے ہندو مسلم اتحاد کی تحریک شروع کی تھی۔ یہ بات دار العلوم کے مہتمم اور عثمانی خاندان کے بعض بزرگوں کو سخت ناگوار تھی، لیکن اس کا افسوس ناک پہلو یہ تھا کہ یہ بزرگ اس میدان کے مرد اور فکر ورائے کے اشخاص نہ تھے تو نہ تھے، انگریزوں کے ایجنٹ بن گئے تھے۔

(۳)
قدیم وجدید کی خلیج

مسلم ہندوستان میں ایک ہی نظام اور نصاب تعلیم رائج تھا۔ اس سے نکل کو لوگ اپنے اپنے ذوق وحالات کے مطابق انتظامیہ، عدلیہ، تجارت، زراعت، صنعت، حرفت، تصنیف وتالیف، درس وتدریس، دعوت وارشاد، دینی وملی اور قومی وملکی خدمات کے مختلف میدانوں کا انتخاب کرتے تھے۔ ہر شخص پر اس کے ذوق، استعداد اور ہمت کے مطابق ترقی اور کامیابی کی راہیں کھلی ہوئی تھیں۔ قدیم وجدید کی کوئی تفریق نہ تھی۔ سرسید، نذیر احمد، حالی، محسن الملک، وقار الملک وغیرہم سب نے ایک ہی نصاب پڑھا تھا اور اپنے اپنے ذوق اور صلاحیتوں کے مطابق قومی وملکی زندگی میں بلند مقام حاصل کیا تھا۔ انگریزوں کے لیے یہ نظام تعلیم نامانوس اور ان کے مصالح کے خلاف تھا۔ انگریز رفتہ رفتہ نظام تعلیم میں جو تبدیلیاں لائے اس نے ملک کو قدیم وجدید، دو حصوں یا طبقوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک طبقہ رجعت پسند تنگ نظر اور زندگی کے بارے میں محدود تصور رکھنے والا کہلایا تو دوسرا ترقی پسند اور روشن خیال کہلایا۔ کچھ لوگ قدامت پرست تھے اور اپنے قدیم نظام کو سینے سے لگائے ہوئے تھے، کچھ جدید تھے جنھوں نے سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ پہلوں پر رفتہ رفتہ حکومت کی طرف سے معاش کے دروازے بند ہوتے چلے گئے، دوسروں پر معاش کی راہیں کھلتی گئیں۔ ان دونوں میں نہ صرف فکر ونظر کا اختلاف پیدا ہو گیا بلکہ معاشی حیثیت سے بھی دو طبقے بن گئے اور دونوں کی سماجی حیثیت میں بھی زمین وآسمان کا فرق پیدا ہو گیا۔ پہلے مذہب پرست اور دین دار کہلائے تو دوسرے دنیا دار بلکہ بے دین مشہور ہوئے۔ حالاں کہ نہ پہلوں میں

سب دین دار تھے اور نہ دوسروں میں سب دنیا دار اور بے دین تھے، لیکن ہوا یہ کہ مسلمانوں کی اجتماعی قوت دو متخالف بلکہ متحارب فریقوں میں تقسیم ہوگئی۔

دونوں فریق اپنی اپنی جگہ مطمئن تھے اور کسی کو مسلمانوں کی اجتماعی قوت کی تقسیم اور اس کے ضیاع کا احساس نہ تھا، لیکن دنیا قوم کے واقعی دردمندوں اور سچے غم گساروں سے خالی نہ ہوگئی تھی۔ ان کی آنکھیں ملت کی بہترین صلاحیتوں اور قوتوں کے ضیاع پر اشک افشاں تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ملت کے یہ دونوں طبقے قومی اور اجتماعی و ملی زندگی میں ایک دوسرے کی طاقت بن جائیں اور ان کی قوتیں اور صلاحیتیں ملت کے بہترین مقاصد کے حصول اور قوم و وطن کی تعمیر میں صرف ہوں اور ان کے اختلاف و انتشار سے برٹش استعمار کسی قسم کا فائدہ نہ اٹھا سکے۔ حضرت شیخ الہند نے اس جدید تعلیم یافتہ طبقے کی طرف ہاتھ بڑھایا اسے اپنے ساتھ ملانے اور دونوں کے مابین خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی۔ مسلم یونیورسٹی کے صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کو دارالعلوم آنے کی دعوت دی، آپ کے مساعی سے ایک معاہدہ طے پایا (ا) کہ دارالعلوم کے طلبہ علی گڑھ جائیں گے اور ایک مختصر مدت میں انگریزی کے ایک مخصوص نصاب کی تکمیل کریں گے اور علی گڑھ کے فارغ التحصیل دیوبند آئیں گے اور ایک مختصر مدت میں عربی زبان اور اسلامیات و قرآن کے ایک خاص نصاب کی تکمیل کریں گے۔ اگرچہ اس معاہدے کے تحت جو پہلا طالب علم انیس احمد دیوبند آیا، وہ سی آئی ڈی کا شخص تھا۔ اس کی وجہ سے جو مشکلات پیدا ہوئیں اور اس نے اپنی خدمات کا جو صلہ پایا، وہ ایک الگ موضوع ہے۔ لیکن اس شخص کے اعمال کے لیے علی گڑھ کو الزام نہیں دیا جاسکتا ہے۔ اگر علی گڑھ کے ایک طالب علم نے انگریز کے لیے جاسوسی کا فریضہ انجام دیا تھا تو دارالعلوم کے محترم مہتمم اس سے زیادہ گھٹیا انداز میں جاسوسی اور رپورٹنگ کے ذریعے یہی خدمت

انجام دے رہے تھے۔

سی آئی ڈی کی ملازمت کو تو کسی نے حرام قرار نہیں دیا تھا۔ انیس احمد کے فرائض منصبی میں یہ شامل تھا کہ وہ دیوبند اور اس کے بزرگوں کے حالات سے اپنی گورنمنٹ کو مطلع کرے۔ اس کے لیے یہ کوئی جرم نہیں تھا۔ حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے بھائی مولوی مظہر علی بھی سی آئی ڈی کے محکمے میں ملازم تھے۔ اگر یہ ملازمت حرام ہوتی تو حضرت تھانوی انھیں ملازمت کیوں کرنے دیتے۔ بلکہ وہ اس کے حرام ہونے کا فتویٰ دے دیتے۔ اگر سی آئی ڈی کی ملازمت حرام نہیں تھی تو ملازمت کے فرائض ذمہ داری، دیانت داری اور خوش اسلوبی سے ادا کرنا شرعی طور پر فرض تھا۔ دیوبند کے بزرگوں کو اس بات کا بہت رنج تھا، لیکن انھوں نے سی آئی ڈی کی ملازمت کو حرام قرار نہیں دیا۔

انیس احمد اور مولوی مظہر علی تھانوی کی ملازمت اور ان کی جاسوسانہ سرگرمیوں کے لیے تو ہمیں نے جواز پیدا کر دیا لیکن شمس العلماء حافظ محمد احمد کی خفیہ خبر رسانی کی حرکات خفیفہ کا کیا جواز تھا؟ ان کے فرائض منصبی میں تو یہ بات شامل نہ تھی۔ انھوں نے نہایت شرمناک اخلاقی اور قومی و ملی جرم کیا تھا۔ اتنا بڑا جرم کہ قاسمی، عثمانی یا فاروقی تھانوی خاندان اور، کراچی، اور لاہور کے کسی دارالعلوم یا جامعہ کا کوئی مفتی بھی آج تک اس کے جواز کا فتویٰ نہیں دے سکتا۔

ہمیں اس بات کو نظر انداز نہیں کر دینا چاہیے کہ علی گڑھ دیوبند معاہدے سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک تیسری قوت تاک میں تھی۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور اس معاہدے کی ناکامی کا نقصان مسلمانوں کے حصے میں آیا۔

بہ ہرحال علی گڑھ اور دیوبند کا یہ معاہدہ حضرت شیخ الہند کی بصیرت، قومی دردمندی، بلند خیالی اور علوہمت پر شاہد عدل ہے۔ اس کے بعد ۱۹۲۰ء میں ترک موالات کے زمانے میں نیشنل یونیورسٹی (جامعہ ملیہ اسلامیہ) کے افتتاح کے موقع پر حضرت نے جو خطبہ دیا تھا اس میں تو گویا آپ نے اپنے دردمند قلب کے ٹکڑوں کو صفحہ کاغذ پر پھیلا دیا ہے۔ یہ خطبہ آپ کی ملی غم گساری اور دردمندی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔

انگریزوں نے ہندوستان میں جو نظام تعلیم رائج کیا تھا اور اس کے جو تلخ نتائج سامنے آئے تھے اور ملت اسلامیہ کی اجتماعی قوت جس طرح دو مخالف و متحارب فریقوں میں تقسیم ہوگئی تھی، اس میں انگریزوں کی خوشی کا ہت سروسامان تھا لیکن حضرت شیخ الہند اور دوسرے دردمندان قوم جو قدیم اور جدید تعلیم یافتہ دونوں طبقوں میں تھے، اس تفریق اور تشتت سے لتنے ہی زیادہ غم گیں تھے۔

مولانا عبید اللہ سندھی نے حضرت شیخ الہند کے ایما اور مشورے سے اس تفریق کو مٹانا، تشتت کو دور کرنا اور مابین خلیج کو پاٹنا چاہا تھا۔ جمعیت الانصار کے تحت علی گڑھ کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا جو انتظام کیا گیا تھا، ان کے لیے معقول وظائف کا بندوبست کیا گیا تھا اور جس طرح انھیں قوم کا قیمتی سرمایہ سمجھ کر ان کی عزت و توقیر کی جاتی تھی، اسے بعض متقشف علماء اور دارالعلوم کے ارباب اہتمام سخت ناپسند کرتے تھے۔ اس لیے یہ وجہ بھی مولانا عبید اللہ سندھی کی مخالفت میں شدت کا باعث ہوئی اور جوش جذبات میں اس نظام ہی کو تہس نہس کر دیا گیا۔ خواہ اس مخالفت میں انگریزوں کی خوشنودی کا جذبہ شامل نہ ہو اور خواہ اس مخالفت کی وجہ ان کی دین داری کا جذبہ ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس مخالفت کا، جس کا نشانہ مولانا سندھی مرحوم کی ذات کو بنایا گیا تھا،

فائدہ تو برٹش حکومت ہی کے حصے میں آیا۔ اب اگر اس میں انگریزی حکومت کی خوشنودی اور اس کی وفاداری و خدمت گزاری کا جذبہ شامل تھا اور یقین ہے کہ ایسا تھا اور اس عمل کے لیے حکومت کا اشارہ بھی موجود تھا، تو واقعتاً یہ بڑے شرم کی بات تھی۔ اس کے لیے ارباب اہتمام اور ان کے ہم خیال دیوبند کے عثمانی خاندان، تھانہ بھون کے فاروقی خاندان اور دیگر علماء کو تاریخ معاف نہیں کر سکتی۔

حاشیہ:

(ا) ۱۹۱۰ء میں دارالعلوم دیوبند کی جلسہ دستار بندی میں صاحبزادہ مرحوم نے شرکت اور علی گڑھ کی نمایندگی فرمائی تھی اور حضرت شیخ الہند سے مشورے کے بعد دونوں دارالعلوم میں ربطہ ان کے طلبہ کے تبادلے اور مخصوص نصاب کے تحت تعلیم کی ضرورت کی تجویز صاحبزادہ مرحوم ہی نے پیش کی تھی (علماے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے از مولانا سید محمد میاں، حصہ اول، ص ۱۳۱)

(۴)

مولانا محمد علی کا اکرام اور قدر افزائی

علی گڑھ سے تعلیم یافتہ نسل میں ،جس نے سرسید مرحوم کی آنکھیں دیکھی تھیں ، مولانا محمد علی (رام پوری) اپنے قومی جذبے ، حریت پسندی ، ملی غیرت ، دینی حمیت ، ذوق حق گوئی ، بہادری وغیرہ میں غیر معمولی صلاحیتوں اور خوبیوں کی مالک شخصیت تھے ۔ انھوں نے علی گڑھ میں انگریز پرستی اور استعمار دوستی کے ماحول میں تعلیم پائی تھی ،لیکن ان کی فطرت کے جوہر سعادت نے ان کی رہنمائی کی ، فیروز بختی نے سہارا دیا ، اقبال مندی نے آگے بڑھایا ، کھلی آنکھوں سے زمانے کے انقلاب اور ہندوستان کے بدلتے ہوئے حالات کو دیکھا اور حریت نوازی اور استعمار دشمنی کی راہ پر چل کھڑے ہوئے ۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن سے تعارف ہوا تو ان کے علم و تقویٰ ، ذوق جہاد آزادی اور حریت پروری سے ایسے متاثر ہوئے کہ ہمیشہ کے لیے حضرت کے ارادت مندوں اور عقیدت کیشوں میں شامل ہوگئے ، حضرت علیہ الرحمہ کو ایسے نوجوانوں اور قوم کے جاں نثاروں کی تلاش رہتی تھی ۔ حضرت نے ان کے جذبہ حریت کو سراہا ، ذوق جہاد آزادی کی تربیت کی اور قومی و ملی رنگ کو پختہ سے پختہ تر کردیا ۔ حضرت شیخ الہند ان کی قابلیت کے قائل اور صلاحیت کے معترف تھے ۔ اگرچہ بہت سے جدید تعلیم یافتہ حضرات قوم وملت کی توقعات پر پورے نہیں اترے تھے ،لیکن حضرت کو امید تھی کہ اسی خاکستر میں کوئی جوہر قابل چھپا ہوگا ،جس کی درخشانی سے ایک روز قوم کے مقدر کا ستارہ جگمگا اٹھے گا ۔ حضرت کی نظر جوہر شناس نے ایک نہیں کئی جوہر قابل تلاش کیے اور اپنی نظر کیمیا اثر سے انھیں قوم وملت کے آسمان کے جگمگاتے ہوئے ستارے بنادیا ۔ ڈاکٹر مختار

احمد انصاری، تصدق احمد خاں شیروانی، عبدالمجید خواجہ، حسرت موہانی، شوکت علی، محمد علی، ظفر علی خاں، مولانا حمید الدین فراہی، مظہر الحق وغیرہم ایسے ہی جوہر قابل تھے جن پر قوم وملت کو فخر ہے، یہ سب وہ لوگ ہیں جنھوں نے جدید تعلیم کی تحریک کے دور عروج میں ہوش سنبھالا تھا لیکن علی گڑھ کی استعمار پسندانہ اور انگریز پرستانہ تحریک سے بہت تھوڑے اثرات قبول کیے تھے۔ ان میں مولانا محمد علی اپنی علمی وعملی صلاحیتوں اور جوش ملی وقومی، حریت فکر اور حمیت دینی میں ایک خاص ذوق وسیرت کی مالک شخصیت تھے۔

یہ تحقیق اس وقت ہمارا موضوع نہیں کہ مولانا محمد علی کی سعادت مندی اور فیروز بختی انھیں حضرت شیخ الہند کے حضور میں لے گئی تھی یا حضرت کے کمند فکر نے اس بلند پرواز شاہین کو اپنی نظر وبصیرت کا اسیر اور ذوق حریت اور قومی وملی خیر خواہی کا شیدا بنالیا تھا۔ البتہ یہ حقیقت ہماری نظروں کے سامنے اور ہماری دلچسپی کا موضوع ہے کہ مولانا محمد علی حضرت شیخ الہند سے نسبت ارادت اور نہایت عقیدت رکھتے ہیں اور حضرت ان مرحوم کی صلاحیتوں کے قدردان ہیں اور ان کی علمی قابلیتوں، عملی استعداد اور ذوق حریت نوازی سے قومی تحریک آزادی کے روشن مستقبل کی بہترین توقعات رکھتے ہیں۔ ان کے جوہر سیرت کی تربیت فرماتے ہیں، ان کی قدر افزائی کرتے ہیں اور ایک موقعہ پر اپنے سر سے عمامہ اتارتے ہیں اور محمد علی کے سر پر باندھ دیتے ہیں۔ خرد نوازی اور ایک جدید تعلیم یافتہ نوجوان کے اکرام کی یہ ایسی مثال ہے کہ طبقہ علما میں شاذ کے درجے میں اس کا جواب ملے گا۔

حضرت شیخ الہند کے اس عمل کا ظہور میں آنا تھا کہ دیوبند کے طبقہ علماء ومشائخ میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ ان کے نزدیک یہ عمل گویا علما کی عزت خاک میں ملادینے کے مترادف تھا۔ وہ اس کا تصور بھی نہ کرسکتے تھے کہ ایک روز حضرت

قاسم العلوم مولانا قاسم نانوتوی دارالعلوم دیوبند کے بانی اعظم کے شاگرد رشید مولانا محمود حسن مدرسۃ العلوم کے بانی سرسید احمد خاں کے ایک شاگرد اور جدید تعلیم یافتہ نوجوان محمد علی جوہر کے سر پر اپنی دستار مبارک اتار کر باندھ دیں گے! افسوس! یہ حضرات فکر وہمت کی جن پستیوں میں تھے وہاں سے وہ حضرت شیخ الہند کے فکر کی بلندی، علوہمت، دور بینی اور جوہر شناسی کا اندازہ ہی نہ کر سکتے تھے۔

اگرچہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اس عمل کا مولانا عبید اللہ سندھی کے مشورہ وتحریک سے کوئی تعلق نہ تھا۔ مولانا سندھی اس موقع پر موجود نہ تھے۔ حضرت کے عزم وارادے کا بھی انھیں علم نہ تھا لیکن نزلہ بر عضو ضعیف کے مصداق ان لوگوں کا غصہ مولانا سندھی پر اترا۔ ان کے جرائم کی فہرست میں اس ناکردہ گناہ کا اضافہ بھی کر لیا گیا کہ اس نے دارالعلوم کے مقدس علما کی عزت کو علی گڑھ کے بے دینوں اور نیچریوں کے قدموں میں لٹا دیا۔

افسوس کہ انھیں اس وقت شرم نہ آئی جب قاسمی غیرت اور حمیت ملی کو گورنر یوپی کے حضور میں سپاسنامہ پیش کر کے اور کتب خانہ دارالعلوم کے خلوت کدے میں خوشامدانہ جذبات پیش کر کے لٹا رہے تھے اور گورنر ان کے چہروں پر ایک نظر حقارت ڈال کر مسکرا رہا تھا۔ شرم کی بات یہ تھی، جو دیوبند کی سرزمین پر اور دارالعلوم کے اسلامی اور دینی مرکز میں ہوئی تھی۔ سیکرٹری حکومت یوپی، حکومت ہند کے سیکرٹری کو یہ خوش خبری سناتا ہے:

○ "ہز آنر (گورنر یوپی سر جیمس مسٹن) نے یکم جنوری ۱۹۱۵ء کو کالج (دارالعلوم) کا دورہ کیا اور اس کے باوجود کہ محمد علی اور دہلی کے ایجی ٹیٹر جلسے میں موجود تھے، ہز آنر کا شاندار استقبال کیا گیا۔

دارالعلوم کے تمام افراد کی موجودگی میں رسمی (خیر مقدمی اور شکریے

کی) تقاریر کا تبادلہ ہوا اور

○ اس کے بعد دارالعلوم کے کتب خانے میں خوش گوار ماحول میں دل کھول کر آزادانہ تبادلہ خیال ہوا۔ اس طرح باہم دوستی اور تعلقات قائم ہوئے۔

○ کالج کے پرنسپل (مہتمم دارالعلوم مولانا محمد احمد) کو وائسرائے کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب دینے اور (ان کی جانب سے) بالکل غیر متوقع طور پر پیش کیے گئے سپاس نامہ سے یہ روابط مزید استوار ہوئے ہیں۔ لیفٹننٹ گورنر کا خیال ہے کہ اس کے نتائج دور رس اور قابل اطمینان ہوں گے۔"

واضح رہے کہ یہ سر جیمس مسٹن وہی گورنر تھا جس نے کان پور میں مچھلی بازار کی مسجد کے ایک حصے کو پولیس کی سنگینوں کے سائے میں تڑوا کر پھنکوا دیا تھا اور مسلمانوں کی درخواست اور التجا کو درخور اعتنا نہ سمجھا تھا۔ اس کی مسلم دشمنی کی مولانا محمد علی سے اس کی مراسلت گواہ ہے۔ مولانا محمد علی اپنے اخبار ہمدرد اور کامریڈ میں اس پر طنز و تنقید کر چکے تھے اور اس کی مسلم دشمنی پر مقالات لکھ چکے تھے۔ دارالعلوم میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے صاحبزادے شمس العلماء مولانا محمد احمد اور دیوبند کے نامور عثمانی خاندان کے بطل جلیل مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (ابن مولانا فضل الرحمٰن عثمانی) اپنے برادران گرامی قدر مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی اور علامہ شبیر احمد عثمانی کے ساتھ دارالعلوم کے کتب خانے کی خلوت گاہ میں مصروف رازونیاز تھے اور سر جیمس مسٹن کے ذریعے دنیا کے سب سے بڑے استعمار اور قوم و وطن دشمن حکومت سے روابط استوار اور مستحکم کر رہے تھے۔ مولانا محمد علی ان خلوتیان رازو نیاز میں شامل نہیں تھے، لیکن جلسہ عام میں جب خیر مقدمی تقریر اور رسم شکریہ ادا کی جارہی تھی تو وہ حیرت زدگی کے ساتھ دیوبند کے قاسمی اور عثمانی خاندان

کے صاحب زادگان کی سیرت کی پستی اور اخلاق باختگی کا نظارہ ضرور کر رہے تھے اور زبان حال سے کہہ رہے تھے کہ خدایا دیوبند کی سرزمین پر اسلامی و ملی غیرت اور قومی حمیت کی تباہی کا یہ الم ناک منظر دیکھنا بھی قسمت میں لکھا تھا!

مولانا محمد علی کی بے لگام زبان سے ہمیں بھی شکایت ہے۔ قومی زندگی میں ان کے فکر کی غلطی اور بعض رویوں سے نقصان بھی پہنچا ہے ۱لیکن ان کا قلب صاف، جذبہ صادق اور ان کی استعمار دشمنی شک و شبہ سے بالا تھی۔ حضرت شیخ الہند نے مرحوم کی سیرت اور ذوق کے اسی پہلو سے متاثر ہو کر ان کے سر پر اپنا عمامہ رکھ دیا تھا۔ وہ عالم دین نہ تھے۔ دینی رہنما کی حیثیت سے ان کی توقیر نہ کی گئی تھی۔ ان سے ملک و ملت کی خدمت کا کام لینا تھا، جس کے وہ ہر طرح اہل تھے۔

حاشیہ:

(۱) مولانا محمد علی مرحوم کے حق میں ہمارے بزرگوں سے بھی بعض کوتاہیاں ہوئیں، جن کی بدولت وہ فرنگی محل کے علما کے حلقہ ارادت میں چلے گئے اور علمائے دیوبند کی قومی و ملی تحریک کو ان کی ذات سے کوئی خاص فائدہ نہ پہنچ سکا، لیکن وہ نہ صرف حضرت شیخ الہند بلکہ آپ کے بعد آپ کے بعض نامور تلامذہ مولانا سید حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ دہلوی، علامہ انور شاہ کاشمیری وغیرہم کے ہمیشہ معتقد رہے اور ان کے بارے میں کبھی ان کی زبان سے کوئی بے جا لفظ نہیں نکلا۔ ہمارے ان بزرگوں نے بھی ان کے اخلاص کا ہمیشہ اعتراف اور ان کے جذبات کا ہمیشہ احترام کیا۔

(۵)
ایک اور مسئلہ

البتہ ایک اور مسئلہ ہے جو مولانا عبید اللہ سندھی کی تکفیر اور دیوبند سے ان کے اخراج کا باعث بنا تھا۔ اس مسئلے کی طرف خود مولانا سندھی نے اقبال شیدائی کے نام ایک خط میں اشارہ کیا ہے۔ مولانا کہتے ہیں:

> "آپ کو معلوم نہیں کہ میں مولانا نور الدین (۱) مرحوم کی خدمت میں کس طرح حاضر ہوا۔ آپ مولانا محمد علی (لاہوری) اور مولانا صدر الدین سے دریافت کر سکتے ہیں کہ مولانا مرحوم میرے متعلق کیا خیال رکھتے ہیں ان کی دعاؤں کو میں اپنے لیے ایک ذریعہ نجات سمجھتا ہوں۔ محض اس وجہ سے میرے دیوبندی کشمیری دوستوں (۲) نے میری تکفیر سے گریز نہیں کیا۔ مگر میری محبت اس پارٹی سے کم نہیں ہوئی۔"

مولانا عبید اللہ سندھی مرزا غلام احمد قادیانی کے دعاوی کو ہرگز کوئی وقعت نہ دیتے تھے۔ وہ انھیں باطل سمجھتے تھے اور ان کے پیروکاروں کا ان دعاوی پر اعتقاد رکھنا ان کی صریح غلطی سمجھتے تھی۔ مولانا سندھی کے یہ خیالات ان کے خطوط بنام اقبال شیدائی اور افادات و ملفوظات (مرتبہ محمد سرور) میں موجود ہیں۔ لیکن اس وقت تک قادیانی مسئلہ محض ایک فکری اور نظری مسئلہ تھا۔ اس کی وجہ سے مسلم سوسائٹی میں جو پیچیدگیاں اور فساد حکیم نور الدین کی خلافت کے بعد مرزا بشیر الدین محمود کے زمانے میں پیدا ہوا وہ اس وقت تک رونما نہ ہوا تھا۔ اس لیے عام طور پر اس مسئلے میں مسلمانوں کے جذبات میں وہ شدت نہ تھی جو بعد میں پیدا ہو گئی تھی۔ البتہ اس میں کوئی شک نہیں کہ علمائے دیوبند کا مسلک اس باب میں شروع سے آخر تک یہی رہا کہ مرزا غلام احمد

قادیانی اور ان کی پیروکار نہ صرف گمراہ اور بدعقیدہ ہیں بلکہ دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ مولانا سندھی اس فتوے سے اس حد تک متفق تھے کہ وہ گمراہ اور بدعقیدہ ہیں۔ اس لیے ان کے خلاف اس عقیدے کی بنا پر اشتعال پھیلایا گیا ہو تو تعجب نہ کرنا چاہیے۔ لیکن جن حضرات نے مولانا سندھی کے خلاف یہ حربہ استعمال کیا تھا، ان کا اور ان کے اسلاف کا طرز عمل بعد میں بالکل مختلف ہو گیا تھا۔ وہ دیوبند میں مولانا سندھی کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکے۔ لیکن تحریک پاکستان کے دور میں انھوں نے نہ صرف قرآن کی ایک آیت کے متولین کو برداشت کیا بلکہ ان کی قیادت پر بھی ایمان لائے جو پورے قرآن کو محرف اور ناقص مانتے تھے اور اس کے آخری ہدایت ہونے کے منکر تھے، جو عقیدہ رسالت پر امامت کو ترجیح دیتے تھے بلکہ بعض تو توحید و رسالت ہی کے منکر تھے۔ وہ نہ مسلمانوں کے کلمہ میں شریک تھے، نہ نماز روزہ میں، نہ زکوٰۃ میں مسلمانوں کے ہم عقیدہ تھے۔ ان کا پورا نظام عقائد و عبادات الگ تھا۔ ان کے مدارس و مساجد جدا تھیں۔ اعلیٰ درجات کا ان کا نصاب دینیات تو جدا تھا ہی، ابتدائی درجات میں بھی انھوں نے اپنا نصاب الگ کر لیا۔ حتیٰ کہ نظام عقائد و عبادات کی علاحدگی کے بعد اخلاق و معاملات (جو دینیات کے نصاب کا ایک حصہ ہے) کو بھی الگ کروایا اور اسے ایک مسلمان استاد سے پڑھوانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ جو بزرگ سرزمین دیوبند میں مولانا سندھی کے طالب علمانہ وجود کو گویا برداشت کرنے پر آمادہ نہ ہوئے تھے قادیانیوں، آغاخانیوں، اسماعیلیوں، بہائیوں، ملحدوں، کمیونسٹوں اور خدا اور رسول کے دشمنوں کی قیادت پر نہ صرف ایمان لائے اور ان کی عظمت کے گن گائے بلکہ پورے پاکستان میں مسلمانوں پر ان کے اقتدار کو مسلط کرنے کی کوششوں میں حصہ لیا۔ یہ زمانے کی کیسی ستم ظریفی ہے کہ پاکستان میں قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کی تحریک چلی تو

قادیانیوں کو جو پر جوش وکیل صفائی (مولانا عبد الماجد دریا بادی) ملا، وہ سہارن پور کی اسی خانقاہ علم وتصوف کا ارادت مند اور عقیدت کیش تھا، جس کے اکابر و اصاغر مولانا سندھی کو دیوبند سے نکلوانے میں پیش پیش تھے۔ مولانا دریا بادی، مولانا شبیر احمد عثمانی کے صدیق ومخلص اور قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند کے ممدوح تھے۔ انھوں نے نہ صرف یہ کہ قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج نہیں سمجھا، بلکہ انھیں کو سچا مسلمان قرار دیا۔ اور نہ صرف مسلمانوں کی انٹی قادیانی مومنٹ کو غلط قرار دیا اور اس پر سخت تنقید کی۔ بلکہ پاکستان میں مسلمانوں کے اجتماعی اور اس کی دستور ساز اسمبلی کے متفقہ فیصلے پر بھی تنقید کی۔ اس کے باوجود اگر مولانا عبالماجد دریا بادی اس خانقاہ علم و تصوف کے اخلاف کے نزدیک بہت بڑے مسلمان تھے تو مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے مسلمان اور اسلام اور قرآن کے خدمت گذار ہونے میں کون شک کر سکتا ہے۔

اگر سرسید احمد خان کے جنت و دوزخ، ملائکہ، جن، شیطان وغیرہ کے خارجی وجود سے انکار، حور وغلمان کا مذاق اڑانے، قرآن حکیم کی آیات کی نہایت رکیک تاویلات کرنے، حتیٰ کہ غلام احمد قادیانی سے زیادہ باطل عقائد رکھنے کے باوجود اگر دیوبند کے عثمانی اور سہارن پور کے تھانوی خاندانوں اور شمس العلماء محمد احمد کے اخلاف نے سرسید اور ان کے پیرو کاروں کی تکفیر نہیں کی اور علی گڑھ مکتبہ فکر کی شخصیات سے نہایت اخلاص اور محبت کے تعلقات استوار رکھے تو محض اس وجہ کہ سے مولانا سندھی کے بعض قادیانیوں سے تعلقات تھے یا وہ ان کے علم کے معترف تھے، دیوبند سے ان کے اخراج اور ان کی تکفیر کا عمل کیوں کر انجام دیا جاسکتا تھا۔

قادیانی جماعت کے بعض لوگوں کے بارے میں جو خیالات مولانا سندھی کے تھے وہ کوئی عجوبہ نہ تھے بلکہ وقت کے اکثر مشاہیر شبلی، اقبال، محمد علی

، ابوالکلام، سلیمان ندوی کے وہی خیالات تھے۔ ان کے دعاوی و عقائد میں انھیں گمراہ سمجھتے تھے۔ حکیم نورالدین (بھیروی) کو بلند پایہ عالم دین، مولوی محمد علی (لاہوری) کو مفسر قرآن، خواجہ کمال الدین کو مبلغ اسلام سمجھا جاتا تھا اور مابین کسی نہ کسی حد تک سب کے تعلقات تھے۔ اس لیے واقعتاً مولانا سندھی کی تکفیر کی اصل وجہ ان حضرات سے ان کے تعلقات نہیں ہوسکتے۔ عثمانی اور تھانوی مکتبہ فکر کے دور آخر کے بزرگ مولانا عبدالماجد دریا بادی تو قادیانیوں کو کافر نہیں سمجھتے تھے۔ توجن بزرگوں کے وہ فیض یافتہ تھے، وہ مولانا سندھی کو ان سے تعلقات رکھنے کا الزام کیوں کردے سکتے ہیں؟ اس لیے یقین ہے کہ مولانا سندھی کے دیوبندی، کشمیری دوست (مولانا شبیر احمد عثمانی دیوبندی اور مولانا انور شاہ کشمیری) ان کی تکفیر میں ہرگز سنجیدہ نہ ہوں گے۔ لیکن مولانا سندھی مرحوم نے یہ وجہ خود لکھی ہے تو ہمیں یقین کرلینا چاہیے کہ اس بات کو بنیاد بناکر ان کے خلاف ضرور اشتعال پھیلا دیا گیا ہوگا۔ لیکن ان کی تکفیر محض ایک حربہ تھا جو دیوبند سے ان کے اخراج کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ اصل وجہ سیاسی اختلاف اور انگریزوں کے خلاف حضرت شیخ الہند کی تحریک اور اس سلسلے میں مولانا عبیداللہ سندھی کی فعالیت تھی۔

اختلافات کا نتیجہ

ان اختلافات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے اجتماعی مفادات اور قوم و وطن کی آزادی کی ایک عظیم الشان تحریک ختم ہوگئی، قومی و ملی جنگ کا ایک اہم محاذ نیست و نابود ہوگیا، دیوبند کے بہترین دماغوں اور اعلیٰ ذہنی و فکری صلاحیتوں اور انقلاب کے اعضا و جوارح کو ایسا منتشر کیا گیا کہ پون صدی سے زیادہ عرصہ گزرنے کے باوجود علم و عمل کی وہ بہترین صلاحیتیں یک جا نہ ہو سکیں۔ اور قوم و وطن اور دین وملت کی ان اجتماعی صلاحیتوں اور قوتوں سے جو فائدہ پہنچ سکتا تھا، وہ نہیں پہنچ سکا۔ بلکہ حضرت شیخ الہند کی اس انقلابی تحریک سے قاسمی، عثمانی اور فاروقی (تھانوی) خاندانوں کے کٹ جانے کا یہ نتیجہ نکلا کہ اسی نیچریت اور بے دینی کو فروغ حاصل ہوا جس کے الزام میں مولانا سندھی کو دیوبند سے نکالا گیا تھا اور جن بزرگوں نے حضرت شیخ الہند کی انقلابی سیاست اور قیادت سے انکار کیا تھا انھوں نے اور ان کی ذریت نے آغا خانی واسماعیلی شخصیات کو اپنے سروں پر بٹھایا اور ان کے مقاصد کو نہ صرف فائدہ پہنچایا بلکہ ان کے لیے قانونی و شرعی جواز پیدا کیا اور انھیں اتنا مضبوط و مستحکم کر دیا کہ اب اگر ملک کی ساری اسلامی انقلابی قوتیں مل کر بھی ان کا تدارک کرنا چاہیں تو یہ ممکن نظر نہیں آتا۔ اگرچہ حضرت شیخ الہند کی قیادت سے انکار یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک سیاسی اختلاف تھا لیکن اس کی بنیاد چوں کہ بعض اشخاص اور خاندانوں کے ذاتی، محدود اور سطحی مفادات پر تھی، اس لیے نہ صرف ملی اجتماعی تحریک کو نقصان پہنچا، بلکہ دیوبند کے دینی مکتبہ فکر میں بھی اختلاف کی ایک ایسی خلیج پیدا ہوگئی ہے جس کے وجود سے انکار ممکن نہیں۔ اس سے دیوبند کے دشمنوں اور مخالفوں نے ہمیشہ فائدہ اٹھایا ہے اور نقصان خود ان کے حصے میں آیا ہے۔

باب چہارم:

مولانا سندھی کی تکفیر اور دیوبند سے اخراج کے اصل وجوہ

یہ سوال ابھی تشنۂ بحث ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی کے دیوبند سے اخراج کے اصل وجوہ کیا تھے؟

۱۔ جہاں تک مسئلہ تبلیغ کا تعلق ہے، معلوم ہو چکا کہ یہ مسئلہ اتنا بڑا نہ تھا کہ دار العلوم کے ایک نامور اور ذہین و باصلاحیت فرزند کو اس کی مادر علمی سے جدا کر دیا جاتا بلکہ اس پر کفر کا فتویٰ بھی لگا دیا جاتا۔ جب کہ حضرت شیخ الہند کی رائے بھی وہی تھی۔ حضرت شیخ الہند نے اس مسئلے پر جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا اس سے کسی کو اختلاف نہ تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی نے اسے اس باب میں حرف آخر قرار دیا ہے اور مولانا انور شاہ کاشمیری نے مولانا سندھی کے خیالات پر جو ردیہ اختیار کیا تھا اسے اپنی غلط فہمی تسلیم کر کے 'معذرت خواہ ہو گئے تھے۔

۲۔ ہندو مسلم اتحاد کی تحریک میں مصالح ملی کی بنا پر اس کے کسی پہلو سے 'طریقہ کار سے' دائرہ اتحاد سے یا انداز فکر میں کسی خامی کی بنا پر اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس بنا پر دیوبند سے مولانا سندھی کے اخراج اور تضلیل و تکفیر کے فتویٰ کا کوئی جواز نہ تھا۔

۳۔ جدید تعلیم یافتہ حضرات سے ربط وضبط کا مسئلہ بھی اتنا اہم نہ تھا کہ مولانا سندھی کو دیوبند سے نکالا جاتا اور ان کے اس عمل واعتقاد کو ضلالت اور کفر قرار دیا جاتا۔ جب کہ اسی مکتبہ فکر کے لوگ جدید تعلیم یافتہ حضرات کے رجوع کو اپنی بزرگی اور مرجعیت کی دلیل سمجھتے ہیں۔ اب تو ان کے الحاد ونیچر بہت کے افسانے کی خوں گری کا دور ختم ہوگیا۔ اب دین ودنیا کے کسی مسئلے میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کو گم کردہ راہ تو کہا جاسکتا ہے، انھیں کافر نہیں کہا جاسکتا۔ پھر اس شخص کے کفر کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو ان سے وقت کے کسی سیاسی، سماجی یا اجتماعی مسئلے میں اختلاف رکھتا ہو۔

۴۔ حضرت شیخ الہند کا مولانا محمد علی کے سر پر اپنی دستار کا رکھ دینا خواہ کتنا ہی نامناسب اور بے محل مان لیا جائے اور خواہ یہ عمل دیوبند کی عزت کو خاک میں ملا دینے کے مترادف ہی کیوں نہ قرار دے لیا جائے۔ اور خواہ اس عمل کا موجب مولانا سندھی ہی کو کیوں نہ مان لیا جائے لیکن اس بناء پر انھیں کفر کا مستوجب ٹھہرانا تو ہرگز معقول قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ دیوبند سے ان کے اخراج کے لیے یہ وجہ کافی ہوسکتی ہے۔

ان میں سب سے بڑا مسئلہ تبلیغ کا تھا اس کا تعلق مذہب سے تھا لیکن اس کی کوئی ایسی حیثیت نہ تھی جس کی بنا پر کفر تو درکنار فسق وضلالت کا الزام بھی لگایا جائے۔ دوسرے تمام مسائل کا تعلق اجتماعی اور سماجی وسیاسی زندگی سے تھا۔ ان کے اختیار کی اتنی اہمیت نہ تھی کہ مولانا سندھی کے کفر وایمان کا فیصلہ کر دیا جاتا۔ پھر یہ کہ وہ تمام اعمال حضرت شیخ الہند کے ایماء ومشورہ سے انجام دیے جارہے تھے۔ اس لیے ان کے اصل ذمہ دار حضرت شیخ الہند تھے، نہ کہ مولانا سندھی! مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"لیکن سوال یہ ہے کہ اگر یہ سب کچھ علمی اختلافات تھے، تو کیا یہ اختلافات اس قابل تھے کہ ایک سرگرم کارکن کو ضائع کر دیا جائے؟ اگر غور کیا جائے تو اصل تحریک کے محرک اعلیٰ حضرت شیخ الہند تھے، لیکن حضرت شیخ الہند سے کون ٹکر لیتا!"

(تذکرۂ شیخ الہند، بجنور، ۱۹۶۵ء، ص ۷۴-۱۷۵)

جیسا کہ پہلے عرض کیا جاچکا ہے کہ مولانا سندھی سے اختلاف، ان کی تضلیل، تکفیر اور دیوبند سے ان کے اخراج کی وجہ دوسری تھی۔ اس سلسلے میں اب کسی مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ صرف ان بیانات کو نقل کردینے پر اکتفا کیا جاتا ہے، جو براہ راست معلومات تحقیقات، سی آئی ڈی یا گورنمنٹ کی خفیہ رپورٹوں پر مبنی ہیں۔

ا۔ سڈیشن کمیٹی کی رپورٹ میں آیا ہے:

"عبید اللہ سکھ سے مسلمان ہوا ہے اور صوبجات متحدہ کے ضلع سہارن پور میں مسلمانوں کے مذہبی مدرسہ (دارالعلوم) دیوبند میں اس نے مولوی کی تعلیم پائی تھی۔ وہاں اس نے اپنے جنگی (انقلابی) اور خلاف برطانیہ خیالات سے عملہ مدرسہ کے خاص لوگوں اور کچھ طلبہ کو متاثر کیا اور سب سے بڑا شخص جس پر اس نے اپنا اثر ڈالا، وہ محمود حسن تھا جو اس مدرسہ میں بہت عرصے تک ہیڈ مولوی (صدر مدرس) رہ چکا ہے، عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسہ کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے ہندوستان بھر میں ایک عام اسلامی جوش اور مسلمانوں میں برطانیہ کے خلاف تحریک پھیلا دے۔ لیکن اس کی تجاویز کے راستے میں مدرسے کے مہتمم اور انجمن کے لوگ رکاوٹ بن گئے۔ انھوں نے اسے اور اس کے چند ساتھیوں کو مدرسہ کی ملازمت سے برخاست کردیا۔"

(علمائے حق اور ان کے مجاہدانہ کارنامے (حصہ اول) از مولانا سید محمد میاں مراد آباد، ۱۹۴۶ء، ص ۱۶۵)

اس میں مولانا سندھی مرحوم کا جرم انقلابی اور خلاف برطانیہ خیالات کا پھیلانا، بعض خاص لوگوں اور طلبہ کو متاثر کرنا پھر مدرسہ کے تعلیم یافتہ مولویوں (یعنی جمعیت الانصار) کی رفاقت سے ہندوستان بھر میں ایک عام اسلامی جوش مسلمانوں میں خلاف برطانیہ تحریک پھیلا دینا بیان کیا گیا ہے اور مدرسہ (دارالعلوم) کے مہتمم اور انجمن (جمعیت الانصار) کے بعض لوگ (مولانا شبیر

احمد عثمانی) وغیرہ کا کارنامہ اس تحریک میں "رکاوٹ بن جانا" اور مولانا سندھی کو ملازمت سے برخاست کر دینا بیان ہوا ہے۔

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ مولانا سندھی مدرسہ کے ملازم نہیں تھے۔ جمعیت الانصار کے کاموں کی انجام دہی کے سلسلے میں انھیں وظیفہ ملتا ہے جو کہ اس کی نظامت سے استعفے کے بعد بند ہو گیا تھا۔ یہاں اسی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ نقش حیات از مولانا سید حسین احمد مدنی، کراچی

نقش حیات حضرت مدنی ﷫ کی خود نوشت سے ۱۹۵۳ء میں ہندوستان میں چھپی تھی۔ میرے پیش نظر کراچی کی اشاعت ہے۔ اس مین کئی جگہ پر اس مسئلے کے بارے میں بعض اشارات ہیں۔ ایک جگہ پر حضرت فرماتے ہیں:

> (الف) "انھوں (ارباب اہتمام دارالعلوم) نے مولانا عبید اللہ سندھی کی سرگرمیوں کو نہ صرف دارالعلوم دیوبند بلکہ عام مسلمانوں کے لیے بھی خطرناک تصور کیا اور اپنے خیالات کے مطابق ضروری سمجھا کہ مولانا سندھی کا تعلق اس مرکز سے نہ رہے۔ اس زمانے میں اتفاق سے چند علمی مسئلوں میں مولانا سندھی اور دارالعلوم کے دوسرے علما کے درمیان "اختلاف پیدا کرادیا گیا۔" اسی اختلاف کو وجہ قرار دے کر مولانا سندھی کو دارالعلوم سے علیحدہ کر دیا گیا چنانچہ رولٹ کمیٹی کی رپورٹ میں اس طرف اشارہ موجود ہے۔
>
> اس اختلاف نے اگرچہ دارالعلوم کے اساتذہ، ملازمین اور عام طلبہ کو حضرت مولانا سندھی سے بہت زیادہ بعید کر دیا تھا لیکن حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز سے تعلق میں کوئی فرق نہیں آیا۔ خفیہ آمد و رفت جاری رہی۔ رات کی اندھریوں میں دیوبند کے باہر ملاقاتیں ہوتی تھیں اور ضرورت باتیں انجام پاتی تھیں۔"

حضرت شیخ الاسلام کے اس بیان میں یہ جملہ خاص توجہ کا مستحق ہے کہ

"اختلاف پیدا کرا دیا گیا"۔ اس کی وجہ مولانا سندھی کی وہی انقلابی اور استعمار دشمن سرگرمیاں تھیں۔

(ب) دوسری جگہ فرماتے ہیں:

"بہر حال اصل سبب وہ امر ہے جس کی بنا پر مسٹن گورنر یوپی، دیوبند آیا تھا اور دار العلوم میں گیا تھا اور مہتمم صاحب کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا۔"

اس بیان کی بنیاد پر مولانا سید اسعد مدنی نے لکھا ہے کہ:

"اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ دار العلوم سے مولانا سندھی کی علاحدگی خود برطانوی گورنمنٹ کے اشارے پر عمل میں آئی تھی۔"

ایک خود ساختہ داستان۔ حقائق کے آئینے میں، ص ۷)

۳۔ تذکرہ شیخ الہند از مفتی عزیز الرحمٰن (بجنوری) بجنور، ۱۹۶۵ء

تذکرہ شیخ الہند ایک اہم تصنیف ہے اور مفتی صاحب نے اس مسئلے پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

(الف) "جمعیت الانصار کی یہ تنظیم اگرچہ بالکل مذہبی تحریک تھی لیکن حضرت شیخ الہند ملک میں ایک صالح اور قابل معاشرہ تیار کر رہے تھے اور اس کو منظم کر رہے تھے۔ اس لیے کہ آیندہ چل کر ہندوستان کے باہر سے انقلاب لایا جائے تو اندرون ملک ایک منظم گروہ ہونا چاہیے جو انقلاب کو کامیاب بنائے اور ایک اشارے پر رات کی رات میں امریکہ کی طرح حکومت کا ڈھانچا بدل دے۔ اس کے لیے ضرورت تھی کہ ملک کے اندر بہ کثرت لائق اور صالح اپنے افراد موجود ہوں۔ لیکن افسوس کہ اپنی حکومت کے قیام کا یہ منصوبہ کامیاب نہ ہوسکا۔ کیوں کہ تحریک کے ساتھ حکومت کی بدظنی اور اپنوں کی خوشامدانہ پلیسی اور ریشہ دوانیوں میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔"

(ص ۱۷۳)

(ب) "ارباب اہتمام دار العلوم دیوبند مولانا سندھی کی

ان سرگرمیوں کو اپنے اور دارالعلوم کے لیے خطرے کی گھنٹی سمجھتے تھے اور اس خطرے کو مول لینے کے لیے ارباب اہتمام کسی طرح تیار نہ تھے۔ اس لیے انھوں نے علامہ سندھی کے خلاف چند مسائل کھڑے کیے تاکہ ان کو دارالعلوم سے یہ کہہ کر نکال دیا جائے کہ وہ اکابر کے مسلک سے ہٹ گئے ہیں یا گمراہ ہوگئے ہیں یا ان کے افکار و نظریات گمراہ کن ہیں۔ لہٰذا ایسے شخص کا دارالعلوم کی چاردیواری میں رکھنا طلبہ کے لیے مضر ہے۔" (ص ۱۷۲)

(ج) "چناں چہ ارباب اہتمام نے چند مسائل کھڑے کیے اور مولانا کشمیری (انور شاہ) اور علامہ عثمانی (شبیر احمد) کی ٹکر علامہ سندھی سے کرادی۔ دیوبند میں ان ہر سہ حضرات کے درمیان مناظرہ ہوا، جو حقیقت میں مولانا سندھی کے نکالنے کے لیے ایک بہانہ تھا۔ چناں چہ علامہ سندھی کے خلاف ایک ہلڑ بازی کھڑی کردی گئی اور ان کی پوزیشن کو ملک میں مجروح کرنے کی کوشش کی گئی۔" (ص ۱۷۴)

(د) "جمعیت الانصار کے پروگرام اور اس کی تجاویز سے جہاں انگریزوں کو بوکھلاہٹ تھی، وہاں دارالعلوم دیوبند کے ارباب اہتمام کے اقتدار پر بھی شدید ضرب واقع ہو رہی تھی جس کے لیے انھوں نے یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ علامہ سندھی پر علمی اور مذہبی الزامات لگا کر ان کو علاحدہ کر دیا جائے۔" (ص ۱۷۶)

ان چند اقتباسات میں جو مولانا سندھی مرحوم کے جرم، دیوبند سے ان کے اخراج کے حقیقی وواقعی پس منظر اور ارباب اہتمام دارالعلوم کے کارنامے کے تمام پہلوؤں پر مختصراً محیط ہیں۔

۴۔ تحریک شیخ الہند از مولانا سید محمد میاں، دہلی، ۱۹۷۵ء

تحریک شیخ الہند مولانا محمود حسن، دراصل ریشمی خطوط سازش کیس کے وہ ڈاکومنٹس ہیں جو انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہیں۔ انھیں حاصل کرکے اور ترجمہ کرواکے مرتب کرکے چھاپ دیا گیا ہے۔ اس میں بہت تفصیل

کے ساتھ جمعیت الانصار اس کے مقاصد، مولانا عبید اللہ سندھی اور حضرت شیخ الہند کی کارگزاری کا تذکرہ آیا ہے۔ درحقیقت یہ پوری کتاب اور اس کی تمام دستاویزات حضرت شیخ الہند اور مولانا سندھی کی سیاسی انقلابی تحریکؒ کی تفصیلات پر مشتمل ہیں۔

(الف)۔ اس میں جمعیت الانصار کے نظام ومقاصد کے بارے میں لکھا ہے:

"جمعیت الانصار، دیوبند۔ مولوی عبید اللہ کی نظامت اور چھ سات ممبروں پر مشتمل مجلس منتظمہ کے ساتھ ۱۹۱۰ء میں قائم ہوئی۔ یہ انجمن کے طور پر قائم کی گئی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا:

الف۔ مدرسہ دیوبند کا انتظام کرے اور اس کو بہتر بنائے۔

ب۔ مدرسہ کے لیے رقم کا انتظام کرے۔

ج۔ دیوبند میں جن عقائد کی تعلیم دی جاتی ہے ان کی تبلیغ کرے اور انھیں فروغ دے اور دوسرے مقامات پر ایسے ہی مدرسے قائم کرے۔

"تجویز یہ تھی کہ تمام مدارس اسلامیہ کو جمعیت الانصار کے تحت کر دیا جائے اور دیوبند کے فارغ التحصیل مولویوں کو ان مدارس میں مدرس مقرر کیا جائے۔"

اس کے قواعد وضوابط باضابطہ تیار کیے گئے تھے اور اس کے سالانہ جلسے مراد آباد اور میرٹھ میں ہوئے تھے تاکہ جمعیت الانصار کے مقاصد کی تبلیغ کی جاسکے۔

لاہور کی صوفی مسجد کے مولوی ابواحمد نے نائب ناظم کی حیثیت سے ۱۹۱۱ء میں چند ماہ کام کیا۔" (ص ۲۳۳-۲۳۲)

(ب) جمعیت الانصار میں اختلاف، اس کے وجوہ اور مولانا سندھی کے دیوبند سے اخراج کے بارے میں اس میں یہ دفعات ہیں:

○ "ابتدا میں دیوبند کے مدرسے کی ساری مجلس منتظمہ جمعیت الانصار کے حق میں تھی۔

○ جلد ہی (مولوی) عبید اللہ نے انگریزی پڑھے ہوئے نوجوانوں کو طالب علم کی حیثیت سے لینا شروع کر دیا اور اس سے جمعیت نے نیم سیاسی نوعیت اختیار کریں۔

○ جب جنگ بلقان شروع ہوئی اور دیوبند کے ذمہ داروں نے ترکی کی مالی امداد کے جواز کا فتویٰ دیا تو اچانک جمعیت اپنے اصلی رنگ میں آگئی اور انتہائی متعصب جماعت بن گئی۔

○ مولوی طلبہ اور دوسرے لوگ مبلغ بنا کر بھیجے جانے لگے اور ترکی کی مدد کے لیے ہلال احمر کے فنڈ میں بڑی بڑی رقمیں جمع کی جانے لگیں۔

○ غیر ملکی سامان کے بائی کاٹ کی تبلیغ بڑے شد ومد سے کی گئی۔

○ اس کی شاخ قاسم المعارف نے کلکتہ مین چندہ جمع کرنے کے سلسلے مین بہت زیادہ سرگرمی دکھائی۔

○ اس پر مدرسہ کے عملے کے سنجیدہ لوگ چوکنے ہوئے اور ایسے اختلافات پیدا ہوئے کہ عبید اللہ کو ۱۹۱۳ء میں استعفا دینا پڑا۔

○ جلد ہی اس انجمن کا وجود ختم ہوگیا۔" (ص ۲۳۳)

(ج) ایک دوسرے مقام پر ہے کہ

○ مدرسے کی نیک نامی کی بقا کے لیے مجلس منتظمہ نے فیصلہ کیا کہ عبید اللہ کو انیس احمد اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ مدرسے سے خارج کر دینا چاہیے۔

○ مولانا (محمود حسن) نے یہ فیصلہ پسند نہیں کیا۔"

(۵) ایک خود ساختہ داستان۔ حقائق کے آئینے میں از مولانا سید اسعد مدنی دیوبند، ۱۴۰۱ء

مولانا محمد طیب مرحوم نے مولانا اسعد مدنی صاحب کی ایک تقریر کے بعض مطالب سے اختلاف کرتے ہوئے ایک ہشت ورقی کتابچہ "ایک خود ساختہ داستان کی حقیقت" شائع فرمایا تھا۔ اس میں انھوں نے مولانا سندھی مرحوم کے دارالعلوم سے اخراج کے معاملے میں اپنے والد مرحوم "شمس

العلماء مولانا محمد احمد" کا نہ صرف دفاع کیا بلکہ جنگ آزادی مین ان کی رہنمائی کا ذکر بھی کیا۔ اس کے جواب میں مولانا سید اسعد مدنی نے مولانا سندھی کے دیوبند سے اخراج کے معاملے پر بحث کی اور حقائق کی روشنی میں حضرت قاری صاحب مرحوم کے مغالطات کو رفع فرمایا۔ اس کتابچے کے متعدد اقتباسات اس مضمون میں نقل ہو چکے ہیں اس لیے تکرار کی ضرورت نہیں صرف ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

مولانا سید اسعد مدنی لکھتے ہیں:

"حضرت شیخ الاسلام (مولانا سید حسین احمد مدنی)، مولانا مناظر احسن گیلانی اور برٹش حکومت کی سی آئی ڈی سب اس پر متفق ہیں کہ "مولانا عبید اللہ سندھی کا دار العلوم سے اخراج اور جمعیت الانصار کی شکست وریخت محض اس بنیاد پر تھی کہ مولانا سندھی نے ارباب اہتمام کے علی الرغم اس کا رخ انگریز گورنمنٹ کی مخالفت کی جانب موڑ دیا تھا اور حقیقتاً حضرت شیخ الہند کے سامنے جمعیت الانصار کے قیام کا مقصد بھی یہی تھا۔" (ص ۹)

باب پنجم

شمس العلماء مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند

چند تاریخی دستاویزات کے آئینے میں

آیندہ اوراق میں جو دستاویزات پیش کی جارہی ہیں، "دی انڈین مسلمز۔ اے ڈاکومنٹری ریکارڈ" (۱۹۰۰ تا ۱۹۴۷ء) جلد پنجم۔ انڈیسٹ ان ورلڈ وار، مرتبہ شان محمد، دہلی، ۱۹۸۲ء سے ماخوذ ہیں۔ اس جلد میں تمام دستاویزات جنگ عظیم اول کے دور ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء کے بارے میں ہیں۔
یہاں صرف وہ دستاویزات مرتب کی جارہی ہیں جن کا تعلق حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کی تحریک کے بارے میں شمس العلماء مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم دیوبند کے رویے اور کارگذاریوں سے ہے۔
یہ تمام دستاویزات اصلا انگریزی زبان میں مرتب ہوئی تھیں۔ ان کا اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ البتہ اس میں ایک دستاویز "سپاس نامہ" جو سر جیمس مسٹن گورنر یوپی کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا، اردو میں تھا۔ اس کا انگریزی ترجمہ گورنر کے دفتر یا یوپی گورنمنٹ کے سیکریٹریٹ کے کسی فرد نے کیا ہوگا۔ "سپاس نامہ" کا یہ ترجمہ سیکریٹری حکومت یوپی نے اپنے تبصرے کے ساتھ حکومت ہند کو بھیجا تھا اور اس پر کرمنل انٹلی جنس نے اپنے رد عمل کا اظہار کیا تھا۔

چوں کہ اصل سپاس نامہ (اردو) دستیاب نہیں ہے، اس لیے اسے اس کے انگریزی ترجمے سے اردو میں منتقل کیا ہے۔ ترجمے کے اس عمل سے

اس کے مطالب میں فرق نہیں پڑسکتا تھا۔ اس کا مفہوم یقیناً برقرار رہا ہے۔ لیکن اس کی زبان اور اسلوب کی ذمہ داری سپاس نامہ پیش کرنے والوں پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ انھوں نے کسی مفہوم کی ادائیگی کے لیے کیا لفظ استعمال کیا تھا، اس بارے میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی۔ سپاس نامہ میں قرآن حکیم کی چند آیات کے حوالے بھی آئے تھے، ان کے ترجمے کے الفاظ اور مفہوم کی مدد سے حواشی میں آیات کی نشان دہی کی کوشش کی ہے، لیکن ممکن ہے کہ اصل سپاس نامے میں اس مفہوم کی دوسری آیات یا ان کا کوئی ٹکڑا پیش کیا گیا ہو۔

ان دستاویزات کے مطالعے کے بغیر مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے خلاف ہنگامہ آرائی، ان کی تکفیر، دیوبند سے ان کے اخراج اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور ان کی تحریک کے خلاف ارباب اہتمام دارالعلوم کی دشمنانہ کارگذاریوں اور انگریز پرستانہ رویے کا یقین نہیں کیا جاسکتا۔ ارباب اہتمام خصوصاً شمس العلماء مولانا حافظ محمد احمد کا صحیح سیاسی وقومی کیریکٹر معلوم ہی نہیں کیا جاسکتا جب تک ان دستاویزات کا مطالعہ نہ کیا جائے۔

جو دستاویزات یہاں پیش کی جارہی ہیں، کتاب میں ان کے نمبر ۱۱، ۲۱، ۲۲، ۲۴، ۲۵ اور ۲۶ ہیں۔ لیکن یہاں ان کی ترتیب ان کی تاریخ تالیف و ترسیل کے اعتبار سے قائم کی گئی ہے۔

(ا۔ س۔ ش)

(۲۱)

سپاس نامہ

بخدمت سر جیمس مسٹن (گورنر صوبہ یوپی)
دیوبند کے مولویوں کی جانب
۲۷۔ ستمبر ۱۹۱۵ء

ہم (جنھیں بلا مبالغہ تمام با اثر، ریا سے پاک اور بے غرضانہ رواداری رکھنے والوں کا ترجمان کہا جاسکتا ہے۔) نمایندے ہیں ہندوستان میں قائم واحد اسلامی مرکز (دارالعلوم دیوبند) کے جس کا کوئی ثانی نہیں اور ہم باوجود ہر قسم کی تخریبی کوششوں اور بدبختانہ کارروائیوں (۱) کے نہایت ثابت قدمی اور استقلال سے اس کی قدیم پالیسی پر اسے چلا رہے ہیں۔

یور آنر کی خدمت میں اور ان کے توسط سے ہندوستان کے حکمران ہزایکسی لینسی وائسرائے کی خدمت میں مولانا محمد احمد صاحب مہتمم دارالعلوم (دیوبند کو شمس العلماء کا خطاب اور خصوصی سند مرحمت فرمانے پر جو کہ علما کی عزت افزائی اور شاہی عطایہ کی روایات کا نمونہ ہے۔(۲) اپنے پر خلوص قلبی جذبات تشکر کا اظہار کرتے ہیں۔ حکومت کے عمل سے یہی ثابت نہیں ہوتا کہ وہ انھیں مسلمان لیڈروں اور رہنماؤں کی عزت کرتی ہے جو اس کے اہل ہیں، بلکہ آزادی کے دعویداروں کے اس سوال کا جواب بھی فراہم ہو جاتا ہے کہ کیا اعزازات واقعی اہل لوگوں کو دیے جاتے ہیں۔

یہ درست ہے اور اس حقیقت کو ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مادی اور دنیاوی مفادات حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہنا، نہ تو ہمارا فطری رجحان ہے اور نہ ہمارے دینی فرائض کا حصہ ہے، لیکن خدا کی مرضی کے مطابق ہمارے موجودہ حکمران اگر ہمیں کوئی اعزاز دیں تو ہم اسے کیوں نہ قبول کریں اور شایان شان طور پر ان کی ستایش کیوں نہ کریں۔ (۳) اگر ہم ایسا کریں (یعنی اعزاز کی

قدر اور اس پر شکر گذاری کا اظہار نہ کریں) تو خدا معاف کرے، گویا ہم ممنونیت اور شکر گذاری کے اس فرض سے روگردانی کریں گے، جس کی ہمارے پاک مذہب نے ہمیں تعلیم دی ہے۔ اس سے غفلت برت کر ہم حکومت کی نظر میں اور خدا اور رسول کے آگے (۴) اور تمام اخلاقی اصولوں کے آگے ذلیل وخوار ہوں گے۔ ہم ایسے عمل کو سخت اخلاقی کمزوری بلکہ ایک نقطۂ نظر سے گناہ سمجھتے ہیں (۵)۔ ان مسلمانوں کے لیے جو ان آیات پر پختہ ایمان رکھتے ہیں:

(۱) اے پیغمبر! کہہ دو کہ ہر بات خدا کی طرف سے ہے' اور (۲) اس کے حکم کے بغیر ایک پتہ بھی حرکت نہیں کر سکتا' اور (۳) جنھوں نے اللہ کے آگے جھک جانے کا شعار اپنایا ہے' (٦)

اور پر خلوص طریقے سے اس پرانی کہاوت کو سچ مانتے ہیں کہ جو کچھ دوست کی طرف سے آئے خوب ہے۔ (۷) کسی شاہی عطیے اور کسی بلند مرتبت اعزاز کو لینے سے انکار کرنا یا اسے شایان شان طور پر قبول نہ کرنا ناشکر گذاری ہے۔

یہی وجوہ تھے کہ ہم دارالعلوم کے چند بہی خواہ آج یور آنر کے حضور میں حاضر ہیں۔ ہماری حیثیت محض چند افراد کی نہیں ہے، بلکہ ہم قابل تعظیم گروہ کے نمایندہ ترجمان ہیں، جو ایک "حقیقی فرض" ادا کرنے کے لیے آئے ہیں۔ (۸) ہمیں توقع ہے کہ یور آنر بھی "ہمارے لافانی تشکر" کا احساس رکھتے ہیں کہ ہمیں باریابی کا شرف عطا فرمایا۔ (۹)

یور آنر! ہمارا طبقہ (جو دنیاوی لحاظ سے معمولی اور بے مایہ ہے) اس بات سے پوری طرح آگاہ نہیں کہ کون سا طریقہ اظہار تشکر و ممنونیت کے لیے مناسب ہو سکتا ہے ہم اس طریقہ کار کو اچھا نہیں سمجھتے کہ ہر ڈسٹرکٹ کے مسلمانوں کی طرف سے خطوط، ٹیلی گرامز اور قراردادیں روانہ کروا کے سارے ہندوستان میں دھوم مچادیں۔ اس لیے ہم توقع کرتے ہیں کہ یور آنر دارالعلوم کے ہم چند خدمت گذاروں کی نحیف اور کمزور آواز کو (جو اتحاد کے مضبوط

رشتوں میں بندھے ہوئے ہونے کی وجہ سے پورے فرقے اور درحقیقت تمام اعتدال پسندوں کی آواز ہے) ظاہری طمطراق اور شور شرابے کے ساتھ شکریہ ادا کرنے کے عمل کی بہ نسبت زیادہ باوقعت اور موثر گردانیں گے۔

یور آنر! ہمارے اس چھوٹے سے وفد میں نہ تو کوئی جاگیردار ہے اور نہ کوئی رئیس۔ یہ وفد ظاہری رکھ رکھاؤ اور شان وشوکت سے بھی عاری ہے۔ پھر بھی یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ یور آنر کے دور حکومت کا فیضان ہے اور شمس العلماء مولانا محمد احمد کی منیجر شپ (حسن انتظام واہتمام) کا طفیل ہے کہ ہم جیسے بوریہ نشینوں کو یہ دن دیکھنا نصیب ہوا کہ "گم نامی اور تاریکی کے قعر مذلت" سے نکل کر شاہوں کے حضور میں جذبات تشکر وممنونیت پیش کرنے کی "سعادت" حاصل ہوئی۔ (۱۰) یہ دراصل نتیجہ ہے دارالعلوم کی بڑھتی ہوئی افادیت اور اس کے پھیلتے ہوئے اثرورسوخ کا۔

یور آنر! اگرچہ آج ہم ایک خاص "احسان اور عنایت" کا شکریہ ادا کرنے کے لیے حاضر ہوئے ہیں، جو صرف منیجر (مہتمم) صاحب ہی پر نہیں بلکہ ہمارے پورے طبقے پر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ہمارے پیش نظر دارالعلوم کے لیے آپ کی نوازشیں بھی ہیں، جن کا حال منیجر "مہتمم" صاحب وقتاً فوقتاً بتلاتے رہتے ہیں۔ اس نظر کرم کی وجہ سے مسلم پبلک کا دارالعلوم پر اعتماد بحال ہوگا اور اس سے ہماری اس پالیسی کو تقویت ملے گی جس کی تعریف یورپ کے بڑے بڑے آفیسر کرتے رہے ہیں۔

یور آنر! ہم خدا کے حضور سجدہ شکر بجالاتے ہیں کہ مجموعی طور پر ہمارے اور ہمارے فرقے کے درمیان باہم زبردست اعتماد موجود ہے۔ اس کا ثبوت دارالعلوم کے بڑھتے ہوئے ذرائع آمدنی دے سکتے ہیں یا دارالعلوم میں دی جانے والی تعلیم کے اثرات!

جہاں تک ہمارے بس میں ہے، ہم اپنے طبقے کی مذہبی وروحانی ترقی اور بہبودی کے لیے اپنی ذمہ داریوں سے روگردانی نہیں کرتے۔ البتہ ممکن ہے

بعض ناواقف حال افراد دارالعلوم کے تقدس اور مرتبے کو دیکھتے ہوئے ہمارے بعض اعمال سے کبھی کبھار شک وشبہ کا شکار ہوجاتے ہوں۔ لیکن جیسے ہی گفتگو کے ذریعے یاباہم خط وکتابت کے ذریعے انھیں حقائق سے آگاہ کر دیا جاتا ہے تو وہ بھی پوری طرح مطمئن ہوجاتے ہیں۔

ہمارا ایک اور صرف ایک مقصد ہے "مذہبی آزادی کاتحفظ اور صرف مذہبی آزادی کاتحفظ!" اس سے ہٹ کر کسی سیاسی تحریک کو مسترد کرنایاقبول کرنا ہمارے قائم اور ناقابل تبدیلی نظریے کے باہر ہے۔ (۱۱) اگر حکومت اسلام اور اس کے عقائد ورسوم کو اور ہمارے "حقیقی لیڈر" (۱۲) کو واقعی عزت دیتی ہے تو دل اور زبان سے اس کاشکریہ ادانہ کرنایااپنے کسی عمل سے اس کے لیے مشکلات پیدا کرنا "انتہائی ناشکری" اور "معصیت" ہے۔ (۱۳)

یور آنر! ہم نے اپنی واحد اور واضح پالیسی بتلادی ہے۔ فی الوقت شمس العلماء مولانا محمد احمد اس پالیسی کو چلا رہے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ان کے خاندان کے بلند مرتبے اور ان کے شخصی اثرات کی وجہ سے ان کے شاگرد اس پالیسی پر مستقل مزاجی سے قائم رہیں گے۔

ہم اختتام پر یور آنر کے وقت اور توجہ کے زیاں پر معذرت خواہ ہیں اور ایک بار پھر گرم جوشی کے ساتھ یور آنر کاشکریہ اداکرتے ہیں جو صوبے کے اولوالعزم حکمراں اور دارالعلوم کے ہمدرد وبہی خواہ ہیں۔ (۱۴) ہم یہ یقین کرلینے میں حق بجانب ہیں کہ یور آنر زحمت فرماکر ہمارے عاجلانہ لیکن پرخلوص جذبات تشکر اور ممنونیت کو حضور ہزایکسی لینسی وائسرائے بہادر تک پہنچادیں گے۔

ہم یور آنر کی ترقی اور خوش حالی کے لیے دعاگو ہیں۔"

حکومت یوپی نے اس "سپاس نامہ" کے ساتھ ۲۷ر ستمبر کو ایک نوٹ بھی بھیجا تھا۔ جس کا ذکر ۲۸۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کے مراسلہ میں آیا ہے۔ ۲۷ر ستمبر کا حکومت یوپی کا وہ نوٹ تو دستیاب نہیں البتہ سپاس نامہ اور حکومت یوپی کے

نوٹ پر کرسنل انٹیلی جنس نے جو تبصرہ کیا تھا، پیش خدمت ہے۔
حوالہ :گورنمنٹ آف انڈیا۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ ۔ پولٹیکل ڈیپازٹ۔ جنوری ۱۹۱۶ء، نمبر ۴۷)

حواشی :

(۱) تخریبی کوششوں اور بدبختانہ کارروائیوں سے اشارہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا عبید اللہ سندھی کی انگریز دشمن اور ملک کی آزادی کے لیے کوششوں کی طرف ہے۔ جس کا پہلا مرکز دارالعلوم دیوبند تھا پھر اس مرکز کو دہلی منتقل کر دیا گیا تھا۔ اگرچہ حضرت شیخ الہند کے وجود گرامی کی بدولت دارالعلوم میں حریت پسندانہ اثرات اور انگریز دشمن خیالات پھر بھی موجود تھے۔ اور انھیں اثرات کی بہ دولت جنگ آزادی کے ایک اہم محاذ اور انقلاب کے مرکز کی حیثیت سے تاریخ آزادی میں دارالعلوم کا نقش نمایاں ہوا۔

(۲) برٹش حکومت کے کسی اعزاز کو اسلامی حکومت یا خلافت کے اعزاز کے مماثل قرار دینا بڑی زیادتی ہے۔ پھر یہ کہ مولانا محمد احمد کی کیا اہلیت اور خدمت تھی، جس کے اعتراف میں یہ خطاب اور خصوصی سند دی گئی تھی؟ تصنیف وتالیف اور درس وتدریس میں ان کا کوئی نمایاں مقام نہ تھا۔ اگر دارالعلوم کا عہدہ اہتمام اس کی بنیاد تھی تو دیکھنا چاہیے کہ ملک کے اور کتنے دارالعلوموں، کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے شیوخ، پرنسپلوں اور مہتمموں کو اس وقت تک یا اس کے بعد شمس العلماء کے خطابات سے سرفراز کیا گیا؟ واقعہ یہ ہے کہ مولانا محمد احمد کو دارالعلوم اور اس کے حلقہ اثر میں برٹش مفادات کے تحفظ کے لیے خدمات کے اعتراف میں اس خطاب اور سند سے نوازا گیا تھا۔ انھوں نے ایک نازک وقت اور عہد انقلاب میں اپنے تئیں برٹش حکومت کے سیاسی واستعماری مقاصد میں تعاون کے لیے پیش کیا تھا۔ اس لیے دارالعلوم دیوبند اور اس کے حلقہ اثر میں اس خطاب کے سب سے زیادہ اہل وہی تھے۔

(۳) معلوم نہیں یہ کیسے دریافت کر لیا گیا کہ انگریزی حکومت کا مولانا محمد احمد کو شمس العلماء کا خطاب دینا اللہ کی مرضی کے مطابق اور اس کی خوشنودی کا موجب تھا کہ اس کا قبول کرنا، انگریزوں کے اس عمل کی شایان شان طور پر ستایش کرنا اور اس کا شکریہ ادا کرنا لازم ٹھیرا۔

(۴) ان حضرات کے نزدیک چوں کہ بحکم "اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولوالامر منکم" برٹش استعمار اور اس کے حکام کی اطاعت خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کے

ساتھ لازم تھی، اس لیے حکومت سے جذبات تشکر کا اظہار بھی خدا اور رسول کے شکریے کے ساتھ ملزوم کر دیا۔

(۵) انگریزی حکام چوں کہ ان کے نزدیک "**اولو الامر منکم**" میں سے تھے۔ اس لیے ان کے خلاف عمل ذلت وخواری کا موجب بھی تھا اور اخلاقی کمزوری اور گناہ بھی۔

(۶) غالباً ان آیات کی طرف اشارہ ہے (۱) "اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہہ دو ساری باتیں اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔" (۳: ۱۵۴) یا

اے پیغمبر! کہہ دو کہ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کی طرف سے ہوتا ہے (۴: ۷۸)

(۷) شاید اس آیت کا حوالہ دیا گیا ہو جو کچھ خشکی میں ہے اور جو سمندر میں ہے سب کا وہ علم رکھتا ہے۔ درختوں سے کوئی پتہ نہیں گرتا اور زمین کے اندر کی اندھیریوں میں کوئی دانہ نہیں پھوٹتا، مگر یہ کہ وہ اسے جانتا ہے، کوئی خشک اور تر پھل نہیں گرتا مگر یہ کہ (علم الٰہی کے) واضح نوشتے میں مندرج ہے۔" (۶: ۵۹) یا شاید ان آیات کا حوالہ دیا ہو "ہاں! جس کسی نے بھی اللہ کے آگے سر جھکا دیا اور وہ نیک عمل بھی ہوا تو وہ اپنے پروردگار سے اپنا اجر ضرور پائے گا۔ نہ تو اس کے لیے کسی طرح کا کھٹکا ہے، نہ کسی طرح کی غم گینی۔" (۲: ۱۱۲) یا "اور پھر بتلاؤ! اس آدمی سے بہتر دین رکھنے والا کون ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دیا اور وہ نیک عمل بھی ہے اور اس نے ابراہیم کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔" (۴: ۱۲۵)

(۸) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حضرات انگریزوں کو ملک پر ناجائز قابض اور ملک وقوم کا دشمن نہیں "دوست" سمجھتے تھے۔

(۹) یہ وہ حضرات ہیں جن کے بزرگوں نے ہندوستان کو دارالحرب اور انگریز کو ملک اور قوم کا دشمن قرار دیا تھا۔ زمانے کی کیسی ستم ظریفی ہے کہ ان بزرگوں کی اولاد انگریزوں کے بخشے ہوئے خطاب پر فخر کر رہی ہے اور اس پر شکریہ ادا کرنے کو "حقیقی فرض" (مثل نماز، روزہ اور واجبات اسلامیہ وشرعیہ کے) قرار دے رہی ہے؟

(۱۰) شاید مقصد یہ ہے کہ یہ جذبات تشکر وقتی اور کسی فوری مصلحت کے تحت نہیں بلکہ دائمی اور ابدی ہیں۔ اور نیکی کا ایسا عمل جس کے لیے نہ فنا ہے اور نہ جس کے ضیاع کا خطرہ لافانی جذبہ تشکر کا اس کے سوا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے؟

(۱۱) غور فرمائیے! یہ حضرات کس بات میں نصیب کی یاوری پر فخر کر رہے ہیں اور کس زندگی کو "گم نامی اور تاریکی کا قعر مذلت" قرار دیتے ہیں؟ علوم وفنون اسلامی کی تعلیم وتدریس

واشاعت کو؟ صبح وشام قال اللہ وقال الرسول کے ورد اور اعمال اسلامی کو؟ اور کس چیز کو "باعث ممنونیت وسعادت" قرار دے رہے ہیں؟ مزید حیرت اس بات پر ہے کہ ان کے اخلاف کا دعوا ہے کہ ملک کے لیے آزادی کی جنگ میں ان کا حصہ ہے اور پاکستان کا قیام ان کی کوششوں کا رہین منت ہے۔

(۱۲) اگر ان حضرات کے نزدیک دارالعلوم کا مقصد قیام اور خود ان کا مقصد حیات "صرف مذہبی آزادی کا تحفظ" تھا اور انگریزی حکومت کے دور میں وہ انھیں حاصل تھی تو ملک کی مکمل آزادی کی تحریک، ملک سے انگریزوں کے کلی انخلا کی سعی اور قیام پاکستان کی جدوجہد میں ان کے حصے کا کیا سوال! انھیں تو خود اعتراف ہے کہ مذہبی آزادی کے تحفظ کے نظریے سے ہٹ کر کسی سیاسی تحریک کا استرداد وقبول ان کے "قائم اور ناقابل تبدیلی نظریے کے باہر ہے۔"

(۱۳) "حقیقی لیڈر" سے مراد شمس العلماء مولانا محمد احمد ہیں۔ جو انگریزوں کے دشمن نہیں، دوست تھے۔ ریشمی رومال سازش کیس کی ڈائریکٹری مین انھیں انٹیلی جنس نے "حکومت کا وفادار" اور "شریف آدمی "لکھا ہے۔ ان کی وفاداری کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ مولانا عبید اللہ سندھی کے خلاف لوگوں کو بھڑکایا، ان پر کفر کا فتویٰ لگوایا، انھیں دیوبند سے نکلوایا، جمعیتہ الانصار کے ذریعے سیاسی کام کو ملیامیٹ کر دیا، حضرت شیخ الہند کی جاسوسی کرتے رہے اور سہارن پور کے کلکٹر کے ذریعے گورنمنٹ کو اطلاعات فراہم کرتے رہے۔ بلاشبہ ان کی شرافت کا بھی اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہو گا۔

(۱۴) گورنر سرجیمس مسٹن کے ملک وقوم پر احسانات ان حضرات کے عقیدے میں بے شمار ہوں گے۔ ملک وملت اور مسلمانوں کے ایسے محسن کا شکریہ ادا نہ کرنا یقیناً "معصیت" ہی تو تھا۔

(۱۵) مسٹن دارالعلوم کا ہمدرد اور بہی خواہ ہو یا نہ ہو، شمس العلماء مولانا محمد احمد کا ہمدرد اور بہی خواہ ضرور تھا۔ خطاب، خصوصی سند، زمین، وظیفہ، حیدر آباد دکن کی عالی شان ملازمت، کیا کچھ احسان مسٹن نے ان پر نہیں کیا! لیکن بحکم **ھل جزاء الاحسان الا الاحسان** شمس العلماء نے بھی ان کے احسان کا بدلہ مولانا عبید اللہ سندھی کو دیوبند سے نکلوا کر اور حضرت شیخ الہند محمود حسن کو گرفتار کروا کر ادا کر دیا تھا۔

(۲۲)

سپاس نامے اور حکومت یوپی کے نوٹ

پر کرمنل انٹیلی جنس آفس کا نوٹ

۱۔ میرے خیال مین سرجیمس مسٹن ان مولویوں کو اطلاع دیں گے کہ ہزایکسی لینسی نے ان کا پیش کردہ سپاس نامہ انتہائی مسرت سے پڑھا ہے۔
۲۔ میں سپاس نامے کی اشاعت کا مشورہ دینے میں مشکل محسوس کر رہا ہوں۔ دیوبند کی یہ اسپرٹ فیصلہ کن ہے اور اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں یہ اسپرٹ بڑھ رہی ہے (۱)۔ لیکن مولویوں کے اس سپاس نامے کو پاپائے اعظم کے ارشادات عالیہ کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ یہ دیوبند کے صرف ایک حلقے کا ترجمان ہے۔ البتہ حکومت کی یہ فطری ضرورت ہے کہ وہ اپنی شناخت اس جیسے وفادار طبقے کے ذریعے کروائے۔ لیکن بہت محتاط رویہ رکھتے ہوئے تاکہ مسلمان حکومت میں کم سے کم مداخلت کرسکیں۔ یہ یقیناً دانش مندانہ پالیسی ہوگی۔

۳۔ میرے خیال میں ہندوستان کے مسلمانوں میں حکومت کے خلاف چھپی ہوئی خطرناک لہریں کار فرما رہی ہیں اور اب بھی ہیں(۲)۔ ہماری یہ خواہش جائز ہے کہ جنگ میں ہمیں نمایاں اور یادگار کامیابی حاصل ہو، تاکہ جو لوگ شش وپنج کا شکار رہے ہیں کہ ہندوستان میں برطانیہ اسلام کا مقابلہ کرسکتا ہے یا نہیں؟ ان کے ذہنوں سے شکوک وشبہات دور ہو جائیں(۳)۔ جیمس مسٹن کے خط کا پیراگراف نمبر ۶ کے بارے میں خیال ہے کہ دیوبند کے ان مولویوں کے اثر ورسوخ کا اندازہ ان کی حیثیت سے بڑھ کر کیا گیا ہے۔ کیوں

کہ اسے مکہ کے مولویوں نے کمزور کر دیا ہے جو پان اسلام ازم کے لیے ہمدردی کے جذبات رکھتے ہیں اور مذہبی جنونی ہیں۔ (۴)

۴۔ میں اس امر کو پسند کرتا ہوں کہ سپاس نامہ ضرور شائع ہو، لیکن حکومت کی طرف سے نہیں۔ سابقہ تجربے سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کی جانب سے ایسا کرنا جوش وجنوں اور تنازعے کو ہوا دینا ثابت ہو گا۔

حواشی:

(۱) یعنی خوشامد اور وفاداری کی اسپرٹ جس کا تازہ اظہار مولویوں کے اس سپاس نامے میں کیا گیا ہے۔

(۲) شیخ الہند مولانا محمود حسن کی تحریک آزادی اور مولانا عبید اللہ سندھی کی ان کوششوں کی طرف اشارہ ہے۔ جن کی تلاطم خیزیوں نے دیوبند کے جامد ماحول اور خوشامد پسند اور وفادار مولویوں کے حلقے میں تہلکہ مچا دیا تھا۔

(۳) یعنی مسلمانوں کے ذہنوں پر یہ بات نقش ہو جائے کہ برٹش حکومت ہندوستان میں اسلام کے مقابلے میں ایک فیصلہ کن طاقت کی مالک ہے۔ تاکہ مسلمان انگریزوں کے خلاف کسی سازش یا بغاوت کا خیال دل میں نہ لائیں۔

(۴) مراد یہ ہے کہ مولانا عبید اللہ سندھی اور "مکہ کے مولوی" یعنی حضرت شیخ الہند جو اس زمانے میں حج کے لیے مکہ تشریف لے گئے تھے، کی انگریزی حکومت کے خلاف تحریک اور اس کے بڑھتے ہوئے اثرات کی موجودگی میں شمس العلماء اور ان مولویوں کو نہ تو علمائے دیوبند کا "ترجمان" سمجھا جاتا ہے اور نہ "حقیقی لیڈر"۔ دیوبند پر واقعی اثرات مولانا محمود حسن کے ہیں۔ لیکن حکومت کے لیے مصلحت وقت اور برٹش مفادات کا تقاضا یہی ہے کہ اس قسم کے شمس العلماؤں اور خوشامدی مولویوں پر اعتماد کرے، ان سے کام لے۔ البتہ "محتاط رویہ" اختیار کرے۔ حد سے زیادہ ان کی ہمت فزائی نہ کرے کہ وہ خود ہی مطالبات کے ذریعے حکومت کے معاملات میں مداخلت کرنے لگیں۔

(۲۴)

مراسلہ سیکریٹری حکومت یوپی بنام سیکریٹری حکومت ہند محمود حسن دیوبندی کے بارے میں

۲۸۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء

اپنے ڈی او نمبر ۱۵۷۰ر سی مرقومہ ۲۷۔ ستمبر ۱۹۱۵ء کے حوالے سے عرض ہے کہ

۱۔ حکومت ہند کو اس انٹرویو کے نتائج سے یقیناً دل چسپی ہوگی، جو ہز آنر لفٹننٹ گورنر (صوبہ یوپی) اور شمس العلماء مولوی محمد احمد (دیوبند) کے مابین ۲۷ر ستمبر کو ہوا تھا۔ وہ اس دن پانچ مولویوں (۱) کے ساتھ رسمی طور پر ملاقات کرنے، خطاب عطا ہونے پر "شکریہ ادا کرنے" اور اپنی وفاداری کا یقین دلانے آئے تھے۔ ان میں سے ایک مولوی نے سپاس نامہ پڑھا، جس کا ترجمہ اس رپورٹ کے ساتھ منسلک ہیں۔ اس پر مندرجہ ذیل سطور میں تفصیلاً روشنی ڈالی جائے گی۔

۲۔ سپاس نامے کے ساتھ اس مولوی نے ہز آنر کی خدمت میں ایک پمفلٹ بھی پیش کیا، جس میں اخبار زمیندار (لاہور) سے کچھ اقتباسات درج تھے۔ اس پمفلٹ مین مولوی محمد احمد (مہتمم دارالعلوم) کو حکومت کی طرف سے دیے گئے "شمس العلماء" کے دنیاوی اعزاز کو قبول کرنے پر انھیں "زر کلاہندہ" کہہ کر گالی دی گئی تھی۔ اس کا جو جواب دیوبند کے مولوی شبیر احمد (عثمانی) کی طرف سے دیا گیا تھا، وہ بھی ہز آنر کی خدمت میں پیش کیا۔ ان سب کا خیال ہے کہ وہ پمفلٹ الہلال (کلکتہ کے ایڈیٹر) مولوی ابوالکلام آزاد کا لکھا

ہوا ہے۔ چوں کہ ان کی طرف سے کوئی جواب الجواب نہیں آیا' اس لیے یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے اس کا جواب بن نہیں پڑا۔

۳۔ سب (مولویوں کے چلے جانے کے بعد شمس العلماء نے تنہائی مین) بتایا کہ

(الف) انھوں نے سہارن پور کے مجسٹریٹ کو مولوی محمود حسن کے بارے میں بتلا دیا تھا۔

(ب) انھوں نے یہ بھی بتلایا کہ مولوی (محمود حسن اور ان کے ساتھی) ۱۸۔ ستمبر کو بحری جہاز کے ذریعے روانہ ہوگئے ہیں اور اب وہ (مولوی محمد احمد) ان کا پیچھا کریں گے' جو ایک مشکل مرحلہ ہے۔

(ج) انھیں توقع ہے کہ مولوی محمود حسن شریف (۲) مدینہ کے ذریعے انور پاشا سے تعارف حاصل کریں گے اور ان کے ذریعے سے سرحد پر گڑبڑ کی ہمت افزائی کریں گے۔

۴۔ شمس العلماء نے دہلی گروپ کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کی ہیں۔ دہلی گروپ کو سکھ سے مسلمان ہونے والے نومسلم شاگرد عبید اللہ سندھی کی امداد حاصل ہے۔ (۳)۔ انھوں نے بتایا کہ

(الف) محمود حسن جب بمبئی جاتے ہوئے دہلی پہنچے تو ان کا زبردست استقبال کیا گیا تھا۔

(ب) استقبال کرنے والوں میں ڈاکٹر (مختار احمد) انصاری نمایاں تھے۔ وہ مولوی (محمود حسن) کو اپنی موٹر میں بٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔

(ج) شمس العلماء نے ان کا تعاقب نہیں کیا لیکن بعد میں وہ بیگم انصاری سے ملے' جو ان کی مرید ہیں۔ ان سے پوچھ گچھ کی تو

۱۔ ان خاتون نے بتایا کہ ڈاکٹر انصاری نے محمود حسن کو

ایک خطیر رقم دی ہے۔

۲۔ ان خاتون نے ان کی (ڈاکٹر انصاری اور مولانا محمود حسن کی) بات چیت سنی، اس میں مدینہ اور انور پاشا کے نام آئے تھے۔

(د) ڈاکٹر انصاری کے بھائی (حکیم عبد الرزاق) محمود حسن کو رخصت کرنے بمبئی تک گئے۔

۵۔ شمس العلماء کا بیان ہے کہ

(الف) عبید اللہ کی "شرارت آمیز حرکتوں" (۴) کا مرکز دہلی کی فتح پوری مسجد ہے۔ جو ایک نئی سوسائٹی "نظارۃ المعارف القرآنیہ" کا مرکز ہے۔

(ب) اس (سوسائٹی) کا ناظم عبید اللہ ہے۔

(ج) یہ ادارہ سرتاسر آمادہ بغاوت ہے۔

(د) بد قسمتی سے عبید اللہ کو بھوپال سے دو سو روپے ماہوار ملتے ہیں، جو اس کی ہمت افزائی کا باعث ہیں۔

(ہ) شمس العلماء کا پر زور مطالبہ ہے کہ دہلی کو عبید اللہ کے وجود سے پاک کر دیا جائے اور اسے سندھ واپس بھیج دیا جائے

۶۔ اب میں سپاس نامے کے بعض پہلوؤں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کراؤں گا۔

○ یہ سپاس نامہ ایک غیر معمولی نوعیت کی دستاویز ہے۔ ہز آنر (گورنر یوپی) کا خیال ہے کہ حکومت ہند کو اس سے خاص دل چسپی ہوگی۔

○ یہ سپاس نامہ اس کالج کے اراکین کی طرف سے پیش کیا گیا ہے، جس کی شہرت عالم گیر ہے۔

○ جو اسلامی دنیا میں اپنے مذہبی تقدس اور علمی خدمات کی وجہ سے قابل احترام سمجھا جاتا ہے۔

○ اس ادارے میں حصول علم کے لیے وسط ایشیا، ایران، عرب، مصر، یہاں تک کہ چین سے بھی طالب علم آتے ہیں۔ اس کی دینی تعلیم کے اثرات ان تمام علاقوں پر محیط ہیں۔

○ اس کا سنی مسلمانوں پر بلا مبالغہ سب سے زیادہ اثر ہے۔

○ ان مولویوں نے لیفٹننٹ گورنر سے کہا ہے کہ اس سپاس نامے کو جس طرح چاہیں استعمال کریں اور جو بھی موزوں طریقہ سمجھیں اسے شائع کریں۔

○ یہ ایک ایسا اعلامیہ ہے، جس کا بڑا وزن ہے۔

○ اس کے ذریعے نوجوان مسلمانوں کے اس باغیانہ پروپیگنڈے کی تردید ہوتی ہے کہ حکومت سے خطابات حاصل کرنا بے معنی ہے اور بے عزتی کا باعث ہے۔

○ اس سپاس نامے میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جب تک مسلمانوں کو دینی فرایض کی ادائیگی کی آزادی حاصل ہے، اس کے وفادار اور تقدس مآب حضرات پر کیا فرایض عاید ہوتے ہیں۔

○ ہر دو معاملات کے حوالے سے یہ ایک قیمتی ریکارڈ ہے، جو قدامت پسند مسلمانوں کے رجحان کی ترجمانی کرتا ہے۔

○ اس کی قدر و قیمت اس بات سے اور بڑھ جاتی ہے کہ دیوبند کالج کی وفاداری کو متزلزل کرنے اور اس میں مخالف برطانیہ پان اسلام ازم رجحان پیدا کرنے کی مستقلاً کوشش کی جاتی رہی ہے۔

○ یہ ایک ایسا مینی فسٹو ہے جس کو حسب ضرورت مناسب طریقے سے استعمال کرنا چاہیے۔

○ اس سے ان تمام مذہبی نوعیت کے استدلالات کی نفی ہوتی ہے۔ جن پر غیر وفادار اور باغیانہ خیالات رکھنے والے انحصار کرتے ہیں۔

○ سر جیمس مسٹن تجویز کرتے ہیں کہ اس کی باقاعدہ واپسی کی اطلاع دی جائے اور بتلایا جائے کہ حکومت کے پاس ایسی کوئی تجویز ہے کہ اسے کس طرح مشتہر

یا استعمال کیا جائے۔

○ یہ صوبائی سطح کی اہمیت سے کہیں زیادہ بلند اہمیت کی دستاویز ہے (۵)

۷۔لیفٹننٹ گورنر جانتے کہ حکومت کی طرف سے دینی ایجنسیوں کو استعمال کرنے کی کوشش ہمیشہ سنجیدہ اور اکثر محتاط ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت صورت حال ایسی ہے کہ دیوبند کے ان مولویوں کا اقدام از خود بر محل ہے۔

○ تقریباً ایک سال قبل ہز آنر کو انھیں ذرائع سے اطلاع دی گئی تھی کہ کالج میں گڑبڑ ہو رہی ہے۔ اس لیے وہ کالج تشریف لائیں، لیکن اس وقت ہز آنر نے اس تجویز کو یہ کہہ کر رد کر دیا تھا کہ پرنسپل اور اسٹاف کی جانب سے ضابطے کے دعوت نامے کے بغیر وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

○ بعد میں ہز آنر نے یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو کالج کا دورہ کیا اور اس کے باوجود کہ محمد علی اور دہلی کے ایجی ٹیڑ جلسے میں موجود تھے، ہز آنر کا شاندار استقبال کیا گیا۔

○ کالج کے "تمام افراد" (۶) کی موجودگی میں رسمی (خیر مقدمی اور شکریے کی) تقاریر کا تبادلہ ہوا اور

○ اس کے بعد کالج لائبریری میں خوش گوار ماحول میں دل کھول کر آزادانہ تبادلہ خیال ہوا۔ اس طرح باہم دوستی اور تعلقات قائم ہوئے۔

○ پرنسپل (محمد احمد) کو وائسرائے کی جانب سے شمس العلماء کا خطاب دینے اور بالکل غیر متوقع طور پر پیش کیے گئے سپاس نامے (۷) سے یہ روابط مزید استوار ہوئے ہیں۔لیفٹننٹ گورنر کا خیال ہے کہ اس کے نتائج دوررس اور اطمینان بخش ہوں گے۔

حواشی:

(۱) یہ پانچ مولوی کون تھے؟ یقین کے ساتھ تو مولانا محمد احمد (مہتمم دارالعلوم) اور مولانا حبیب الرحمن (عثمانی نائب مہتمم) ہی کا نام لیا جاسکتا ہے۔ ممکن ہے مولانا شبیر احمد عثمانی بھی ہوں کہ ارباب اہتمام کے محبوب تھے اور مولانا عبید اللہ سندھی کو دیوبند سے نکلوانے کے لیے جو جھگڑا پیدا کیا گیا تھا اس میں سب سے زیادہ حصہ انھی کا تھا۔

(۲) شریف مدینہ سے مراد مدینہ کا گورنر بصری پاشا ہے۔ جس کے نام گورنر مکہ غالب پاشا نے حضرت شیخ الہند کے تعارف کا خط دیا تھا اور انور پاشا سے ملاقات کرادینے کے لیے سفارش کی تھی

(۳) دہلی گروپ سے مراد "نظارۃ المعارف القرآنیہ" کے سرپرست اور کارکن ہیں۔ اس میں حکیم اجمل خاں، حکیم عبدالرزاق، ڈاکٹر انصاری، مولانا عبید اللہ سندھی وغیرہ ہیں۔ مولانا سندھی اس کے ناظم اور حکیم اجمل خاں اس کے سرپرست تھے۔ مولانا سندھی کے بعد مولانا احمد علی لاہوری اسے چلاتے رہے تھے۔ شمس العلماء مرحوم کی خدمات کا دایرہ نہ صرف دیوبند میں حضرت شیخ الہند، مولانا سندھی اور جمعیت الانصار کی سیاسی کارگذاریوں کی اطلاعات تک محدود تھا، بلکہ دہلی گروپ کی بارے میں معلومات کی فراہمی تک پھیلا ہوا تھا۔

(۴) آج جن بزرگ کی "خلف طیب" کا دعویٰ ہے کہ ان کے خلف صالح (مولانا محمد احمد) نے تحریک آزادی میں حصہ لیا تھا اور اس تحریک میں دوسروں کی رہنمائی کی تھی۔ اب تاریخ نے ورق الٹا تو معلوم ہوا کہ انھوں نے وقت کے ایک انقلابی اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کے دست راست کی انقلابی سیاسی کوششیں جن کے اصل رہنما حضرت شیخ الہند ہی تھے، ان کے نزدیک "شرارت آمیز حرکتیں" تھیں اور حکومت سے ان کا "پرزور" مطالبہ تھا کہ اس انقلابی کو اس کے مرکز انقلاب سے دور اور دہلی کو اس کے وجود سے پاک کردیا جائے اور اس کی قومی وملی خدمات (یابقول شمس العلماء "شرارت آمیز حرکتوں" کو سندھ تک محدود کردیا جائے۔ اگر مولانا سندھی کے بارے میں ان کے یہ خیالات تھے، تو یقین رکھنا چاہیے کہ حضرت شیخ الہند کے بارے میں بھی ان کے خیالات اس سے زیادہ بلند نہیں ہوسکتے۔ واضح رہے کہ مولانا سندھی اس وقت "کابل منصوبے" کے سلسلے میں دہلی سے نکل چکے تھے لیکن ابھی ملک ہی میں تھے اور سندھ میں منصوبے کی تکمیل کے کاموں میں مصروف تھے۔

(۵) دفعہ ۶ کے ضمن میں شمس العلماء اینڈ کمپنی کے سپاس نامے کی اہمیت کے جن پہلوؤں

کو نمایاں کیا گیا ہے وہ درست! لیکن اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ دارالعلوم، دیوبند کے مرکز انقلاب کو آزادی کی تحریک اور جدوجہد سے دور لے جانے کی یہ کتنی بڑی سازش تھی اور تاریخ کا فیصلہ کتنا سنگین ہے کہ آج ان کے نام لیواؤں پر اسی دارالعلوم کی سرزمین اپنی وسعت کے باوجود تنگ ہوگئی ہے اور انھوں نے جامع مسجد دیوبند میں پناہ لے رکھی ہے۔ آج تحریک آزادی ملک کے حوالے سے ان کا نام لیتے ہوئے شرم آتی ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ حضرت شیخ الہند کی تحریک کی مثال "مثل کلمۃٍ طیبۃٍ کشجرۃٍ طیبۃٍ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء ... الایہ اور شمس العلماء کی تحریک دریوزہ گری کی مثال اس کے "برعکس" (مثل کلمۃٍ خبیثۃٍ..) کی ہے۔

(٦) ان "تمام افراد" میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صدر المدرسین اور شیخ الحدیث دارالعلوم شامل نہیں تھے۔ حضرت اس روز دارالعلوم تشریف نہیں لے گئے مولانا ابوالکلام آزاد دیوبند پہنچ گئے تھے۔ ان کے ساتھ اپنی نشست گاہ میں تشریف فرما رہے۔

(٧) سپاس نامہ سے مراد خیر مقدمی تقریر اور خطاب یابی پر شکریے کی تقریر ہے۔ ارباب اہتمام نے جن خیالات کا اظہار فرمایا تھا اس سے گورنر خوش ہوا اور دوررس اور قابل اطمینان نتائج کی توقع کی۔ ایک سپاس نامہ وہ ہے جو خطاب ملنے کے بعد شمس العلماء مولانا محمد احمد اور چند دوسرے حضرات نے وفد کی صورت میں شملہ جاکر لیفٹننٹ گورنر کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس کا ترجمہ اسی باب (پنجم) کے شروع میں درج ہے۔

(۱۲)

خفیہ مراسلہ سیکریٹری گورنمنٹ آف یوپی بنام سیکریٹری ہوم ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا

۹۔ جنوری ۱۹۱۶ء

بحوالہ ڈی او نمبر ۱۹۳۹، مورخہ ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۵ء

میں آپ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ حکومت (بمبئی) کو تار دے دیا گیا ہے کہ محمود حسن اور خلیل احمد امکانی طور پر اس بحری جہاز پر ہیں جو کویت سے ۱۷ر جنوری ۱۹۱۶ء کو بمبئی پہنچ رہا ہے (۱)۔

○ حکومت بمبئی کو باخبر کر دیا گیا ہے کہ شمالی ہند کے مسلمانوں کی اکثریت ان دونوں کی بے حد عزت اور احترام کرتی ہے۔ اس موقع پر ان کی گرفتاری اور نظر بندی مسلمانوں کے حلقوں میں اضطراب اور بے چینی کا سبب بن سکتی ہے۔ حکومت بمبئی اس صورت حال سے بچنا چاہتی ہے اور تجویز کرتی ہے کہ ان لوگوں کے پہنچنے پر ان کی سختی سے تلاشی لی جائے اور اگر کوئی قابل مواخذہ چیز برآمد نہ ہو تو ان پر سخت نگرانی رکھی جائے اور ان کا جہاں جانے کا ارادہ ہو، وہاں تار کے ذریعے مطلع کر دیا جائے۔ آپ نے اپنے ڈی او نمبر ۴۹۷۴ مرقومہ ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۵ء میں خطرہ ظاہر کیا ہے کہ محمود حسن سرحد کی طرف چلے جائیں گے، اس لیے ہز آنر نے حکومت بمبئی کو تار دے دیا ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ ان کی مجوزہ طور پر سخت تلاشی لی جائے اور پھر انڈیا آرڈیننس کی خلاف ورزی کے الزام میں انھیں پولیس کے زیر حراست الہ آباد پہنچا دیا جائے۔ تجویز کیا جاتا ہے کہ حکومت کے احکام کے مطابق ضروری کارروائی کی جائے۔ آیندہ کارروائی کا تعلق ان کی تلاشی کے نتیجے پر منحصر ہو گا اور الہ آباد میں تفتیش کی جائے گی۔

○ الہ آباد میں محمود حسن اور خلیل احمد کو فی الحال سول جیل میں زیر حراست رکھا جائے گا۔

حوالہ: گورنمنٹ آف انڈیا، ہوم ڈپارٹمنٹ ۔ پولیٹکل ڈیپازٹ پروسیڈ نگز، جنوری ۱۹۱۶ء نمبر ۴۷، صفحہ ۴۰

حواشی:

(۱) حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۵ء کو ایس ایس اکبر جہاز سے حج کے لیے تشریف لے گئے تھے۔ یہ بات پولیس کے علم میں نہیں تھی کہ حضرت کچھ عرصہ عرب میں قیام فرمائیں گے۔ اس لیے وہ جنوری ۱۹۱۶ء میں ان کی واپسی کی متوقع تھی لیکن فروری میں مولانا مطلوب الرحمٰن اور ستمبر ۱۹۱۶ء میں مولانا خلیل احمد صدر مدرس مظاہر العلوم سہارن پور، ان کی اہلیہ، حاجی مقبول احمد اور سید ہادی حسن حج سے فراغت کے بعد تشریف لائے۔ ستمبر میں آنے والوں کو بمبئی میں روک لیا گیا۔ ان کے بیانات لیے گئے اور دو تین روز کے بعد انھیں نینی تال لے جایا گیا۔ نینی تال میں تینوں بزرگوں کو الگ الگ رکھا گیا اور ہر ایک سے متعدد بیانات لیے گئے۔ اب مولانا مطلوب الرحمٰن (مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند اور مولانا شبیر احمد عثمانی مدرس دارالعلوم کے بھائی) کو بھی نینی تال بلاکر شامل تفتیش کرلیا گیا۔ دیوبند اور سہارنپور میں اطلاع پہنچی تو شمس العلماء مولانا محمد احمد اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی سفارش یا ضمانت پر مولانا خلیل احمد، حاجی مقبول احمد اور مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی کو چھوڑ دیا گیا۔ چوں کہ سید ہادی حسن سے نہ کوئی خاص بات معلوم ہوئی تھی نہ آئندہ کے لیے کوئی اطمینان بخش وعدہ ہاتھ آیا تھا اس لیے بالآخر انھیں بھی چھوڑ دیا گیا لیکن انھیں "ایک عرصے کی نظر بندی" کے بعد رہائی ملی۔ دیگر حضرات سے جو معلومات ان کے ارادے یا کسی اتفاق کی بنا پر حکومت کو حاصل ہوگئی تھیں ان کی بنیاد پر تقریباً تین درجن افراد کے بیانات لیے گئے، ان کے گھروں کی تلاشیاں لی گئیں اور محدود اور طویل نظر بندیوں کا سلسلہ شروع ہوا

(تفصیل کے لیے "شیخ الہند مولانا محمود حسن محدث دیوبندی کے مختصر سوانح اور حالات اسیری" از انجمن اعانت نظر بندان اسلام، دہلی، ۱۹۱۸ء)

(۴۵)

(مولانا) محمود حسن کے بارے میں
کلکٹر سہارن پور کی خفیہ رپورٹ جو ہوم ڈیپارٹمنٹ کو بھیجی گئی

۱۔ دیوبند کے شمس العلماء مولوی محمد احمد نے کل یہ اطلاع دی ہے کہ
○ ہیڈ ماسٹر (شیخ الحدیث۔ صدر المدرسین) کا خط موصول ہوا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے (مولانا محمود حسن نے) مدینہ میں انور پاشا سے ملاقات کرلی اور وہ ان سے معاملات طے پاتے ہی دیوبند واپس آجائیں گے۔ ان کے مقاصد یہ ہیں:
(الف) اپنے ایجنٹوں کے ذریعے سرحد پر گڑبڑ پیدا کرنا
(ب) ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف نفرت کو ہوا دینا۔ (۱)
۲۔ انھوں نے بتایا کہ
○ استنبول اور ہندوستان میں غیر وفادار مسلمانوں کے درمیان ریڈ سی (بحر احمر) جانے والے بحری جہازوں کے عملے کے ذریعے کافی خط وکتابت ہوچکی ہے۔
○ بلغاریا کے جنگ میں شامل ہونے اور غیر متوقع طور پر سرویا کے اتنی جلدی پسپا ہوجانے کی وجہ سے غیر وفاداروں کے حوصلے بہت بڑھ گئے ہیں۔
۳۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ڈاکٹر انصاری اور ان کے رشتہ دار (بھائی حکیم) عبد الرزاق اپنے حلقہ احباب میں یہ پھیلا رہے ہیں کہ
(الف) وہ (شمس العلماء) حکومت کو اطلاعات فراہم کررہے ہیں۔
(ب) لیفٹننٹ گورنر نے ہیڈ ماسٹر (صدر مدرس مولانا محمود حسن) کی نظر بندی کی

سفارش کی تھی، جسے وائسرائے نے مسترد کر دیا۔ (۲)
(ج) ان امور کی تصدیق سیکریٹریٹ کے کاغذات سے کر لی گئی ہے۔
۴۔ ہیڈ ماسٹر (صدر مدرس) نے اس قدر اثر ورسوخ کس طرح پیدا کر لیا؟ اس سوال کے جواب میں انھوں نے (شمس العلماء نے) بتلایا کہ
(الف) ان کی عمر (۷۰ سال) کی بزرگی
(ب) ان کی قابلیت اور ان کا تقدس۔
(ج) اور یہ کہ وہ شمس العلماء کے والد مولانا محمد قاسم کے سربر آوردہ شاگرد ہیں۔ شمس العلماء کے والد خود بھی سربر آوردہ مولوی تھے۔ جنھوں نے پچاس سال قبل دار العلوم کی بنیاد رکھی تھی۔
(د) ان کا دار العلوم دیوبند سے تعلق۔ (بہ قول ان کے یہ ہندوستان میں اپنی نوعیت کا واحد ادارہ ہے۔)
۵۔ ان کا (شمس العلماء کا) بیان ہے کہ یہ آدمی (محمود حسن) ترش مزاج اور غیر مصالحانہ طبیعت کا مالک ہے (۳)۔

حوالہ: گورنمنٹ آف انڈیا۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ، پولیٹکل ڈیپازٹ پروسیڈنگز، جنوری ۱۹۱۶ء، نمبر ۷ ۴

حواشی:

(۱) الحمد للہ! ان تمام مراسلات اور گورنمنٹ کی رپورٹوں کے ذریعے حضرت شیخ الہند کی سیاسی کارگذاریوں اور خدمات قوم ووطن کا کیسا بین ومبرہن ثبوت دشمن کے قلم نے بہم پہنچایا ہے۔

(۲) اس وقت جب حضرت شیخ الہند وطن میں تھے تو بلاشبہ حضرت شمس العلماء کی اس تجویز کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ لیکن جب حضرت شیخ الہند ملک سے باہر تشریف لے گئے اور حضرت کی کارگذاریوں کے ثبوت سامنے آئے تو شمس العلماء کے مشورے اور ان کی رائے کی اصابت کو محسوس کر لیا گیا اور حضرت کو گرفتار کرنے میں بالکل تاخیر نہیں کی گئی۔ کیا اس حقیقت کے انکشاف کے بعد بھی اس امر میں شبہ کیا جائے گا کہ حضرت شیخ الہند کو شمس العلماء نے گرفتار نہیں کروایا تھا؟

(۳) شمس العلماء نے بہت صحیح فرمایا کہ حضرت واقعی ترش مزاج اور غیر مصالحانہ طبیعت کے مالک تھے لیکن انگریز یعنی قوم و وطن کے دشمن کے مقابلے میں! اپنے دوستوں، بزرگوں اور خردوں کے لیے نہایت مخلص، بہت شفیق اور رحیم تھے، گویا اشداء علی الکفار رحماء بینھم کی عملی تفسیر تھے۔ انگریزوں (دشمنان قوم و وطن) کے مقابلے میں حضرت کے مزاج کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا کہ ایک دفعہ مولانا محمد طاہر نے پوچھا:

حضرت! انگریزوں کی کوئی چیز اچھی بھی ہے؟

جواب دیا: ہاں! ان کے گوشت کے کباب بہت لذیذ ہوں گے۔

(۲٦)

کلکٹر سہارنپور کی سیکریٹ انفارمیشن

حکومت ہند کے لیے

۱۔ شمس العلماء محمد احمد نے اطلاع دی ہے کہ

○ ہیڈ ماسٹر (صدر مدرس مولانا) محمود حسن تاحال عرب سے واپس نہیں آئے ہیں۔

○ ڈاکٹر انصاری کے بھائی عبد الرزاق کبھی کبھی مطلوب الرحمٰن سے ملنے دیوبند آتے ہیں۔ مطلوب الرحمٰن کنوئیں کھودنے کے شعبے میں ہیں اور آج کل رخصت پر ہیں (۱)۔

○ یہ شخص (مطلوب الرحمٰن) بھی ہیڈ ماسٹر صدر مدرس کے ساتھ عرب گیا تھا اور تقریباً ایک ماہ قبل لوٹ آیا ہے۔

○ یہ دونوں (عبد الرزاق اور مطلوب الرحمن) بلقان میں جرمنوں کی فتوحات کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں اور کہتے پھرتے ہیں کہ جنگ کا فیصلہ ہندوستان میں ہو گا۔ ہندوستان میں جو حفاظتی انتظامات کی کمی ہے، اس کا عبد الرزاق مذاق اڑاتا رہتا ہے۔

۲۔ شمس العلماء نے مزید بتلایا کہ

○ ان کا (شمس العلماء کا) اپنا فرستادہ عبد الاحد کشمیری (جسے انھوں نے مولانا محمود حسن کے حالات کی جاسوسی لے لیے) عرب بھیجا تھا۔ گذشتہ ماہ مطلوب الرحمن کے ساتھ ہندوستان لوٹ آیا ہے۔

○ اس نے (عبد الاحد نے) بتایا کہ ہیڈ ماسٹر (صدر مدرس مولانا محمود حسن) کی ملاقاتیں انور پاشا کے ساتھ جنھیں استنبول کی طرف سے خلیفہ کا نمایندہ مقرر کیا گیا ہے، ایک ہفتہ جاری رہیں۔

○ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ چالیس پچاس ہزار فوجی ترکوں کی سربراہی میں مکہ کے قریب جمع ہوئے اور طائف کے راستے مشرق کی طرف روانہ ہوئے ہیں

تاکہ استنبول میں ہماری فوج کے مواصلاتی نظام کو منقطع کر دیں۔
میرے خیال میں طائف پہاڑوں پر واقع شہر ہے جو مکہ سے دو منزل کے فاصلے پر ہے۔

حوالہ : گورنمنٹ آف انڈیا، ہوم ڈیپارٹمنٹ - پولیٹکل ڈیپازٹ پروسیڈنگز۔ جنوری ۱۹۱۶ء، نمبر ۴۷

حواشی :

(۱) مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی کے دوسرے بھائی مولانا حبیب الرحمٰن (نائب مہتمم دارالعلوم، دیوبند) مفتی عزیزالرحمٰن عثمانی، (مفتی ومدرس دارالعلوم) اور مولانا شبیر احمد عثمانی (مدرس دارالعلوم) تھے آخر الذکر تینوں بھائیوں کا تعلق شمس العلماء پارٹی سے تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کے بارے میں سی آئی ڈی کی رپورٹ (ریشمی خطوط سازش کیس کی ڈائریکٹری۔ کون کیا ہے ؟) میں ہے کہ شبیر احمد شروع میں (مولانا) عبید اللہ (سندھی) کے ساتھ دوستی رکھتے تھے لیکن بعد میں سخت دشمن ہوگئے اور دیوبند سے ان کے اخراج کے خاص ذمہ دار وہی ہیں۔" مولانا مطلوب الرحمٰن عثمانی شروع سے حضرت شیخ الہند کی انقلابی جماعت سے تعلق رکھتے تھے، لیکن حج سے واپسی، گرفتاری اور شمس العلماء کی سفارش وضمانت پر رہائی کے بعد انھوں نے حضرت شیخ الہند کی جماعت سے اپنا تعلق ختم کر لیا تھا اگر چہ شمس العلماء پارٹی میں پھر بھی شامل نہیں ہوئے اور نہ انھوں نے حضرت شیخ الہند کی جماعت کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ ان بزرگ نے "عثمانی خاندان" کی سیاست سے بھی بہت کم تعلق رکھا۔ اپنے بھائیوں میں وہ شاید سب سے شریف تھے اور اخلاقی سطح سے بلند رکھتے تھے۔ حضرت مفتی علیہ الرحمہ کے بارے میں جہاں تک معلوم ہوا ہے وہ اس سیاست سے دور رہے۔ نائب مہتمم مرحوم اس میں پوری طرح ملوث تھے۔

پندرہ روزہ رپورٹ ۱۸ جنوری ۱۹۱۶ء

(۳/۲۷)

پنجاب میں داخلی سیاسی صورت حال

یوروپی جنگ کے حوالے سے تا اختتام ۱۶۔ جنوری ۱۹۱۶ء

بہ ظاہر تو پنجاب کی موجودہ سیاسی صورت حال میں کوئی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ لیکن عام طور پر لوگوں میں بے چینی پائی جاتی ہے اور حالات پر بحث کرتے نظر آتے ہیں۔ بلقان، گیلی پولی، ایران، اور افغانستان کے حالیہ واقعات کو ترکی کے محمڈن اتحادیوں کی جانب سے برطانوی وقار کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اگر چہ برطانیہ دشمن خیالات کھلے طور پر ظاہر نہیں ہوئے ہیں۔ لیکن مسلمان باغیوں کے لیے جرمنی کی امداد کے چرچے عام ہیں۔ افغانستان میں جرمن ترک ایجنٹوں کی مصروفیات اور سرحدی قبائل میں شورش انگیز صورت حال کے متعلق افواہوں سے صوبہ پنجاب کے ہندو سراسیمہ ہیں۔

راولپنڈی ڈویژن کے کمشنر نے اطلاع دی ہے کہ ہندو سخت بے چینی محسوس کررہے ہیں۔ حالاں کہ فی الحال ان کے خوف کے لیے کوئی خاص بات نظر نہیں آتی۔ کابل میں پیدا ہونے والے حالات اور پھیلنے والے خیالات ہر طرف زیر بحث آرہے ہیں۔ ان حالات میں اگر با حیثیت ہندوؤں کو اظہار خیال کا موقع دیا جائے تو حالات میں خوش گوار تبدیلی پیدا ہوسکتی ہے۔ وہ حکومت سے مطالبہ کریں گے کہ مسلمانوں پر زیادہ اعتماد نہ کیا جائے۔ اس (کمشنر راولپنڈی ڈویژن) نے یہ اطلاع بھی دی ہے کہ ان حالات سے مسلمان بھی کچھ زیادہ پر امید نہیں ہیں۔

جالندھر ڈویژن کے ہندو خاص طور پر بے چین ہیں۔ کمشنر یہ بھی لکھتا ہے کہ صورت حال میں موجودہ تبدیلی، ایران میں گڑبڑ اور جرمنی کی پٹھانوں کو بھڑکانے کی کوششوں نے جو جنگ کے امکانات پیدا کردیے ہیں، اس کی وجہ

سے ان (ہندوؤں) کے ذہن خدشات کا شکار ہیں اور وہ یہ بات محسوس کرنے لگے ہیں کہ ان کے مفادات کا تحفظ ہمارے (گورنمنٹ کے) ساتھ اشتراک میں ہے۔

تعلیم یافتہ مسلمان اس بات پر مطمئن نظر آتے ہیں کہ ترکی بلقان کے حالیہ بحران سے نکل گیا ہے۔ ضلع شاہ پور کے مسلمان جہاں وہ اکثریت میں ہیں یہ خیال کرتے ہیں کہ میسوپٹامیہ عراق میں حالات ٹھیک نہیں ہیں۔ قصور ضلع لاہور کے مسلمان ماضی میں بیشتر لاقانونیت کے عادی رہے ہیں، وہ غیر مطمئن ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یورپینوں کو جس درجہ مدافعانہ قوت کی ضرورت ہے، وہ موجود نہیں ہے۔ کابل میں ترکی جرمن مشن (۱) کے بارے میں متعدد افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ امیر کابل نے بہت سے تحائف کے ساتھ وہ تلوار بھی وصول کرلی ہے جو سلطان ترکی کے ساتھ تعاون کے عزم کی علامت ہے۔

ماخذ: گورنمنٹ آف انڈیا ہوم ڈیپارٹمنٹ پولیٹکل ڈیپازٹ، جنوری ۱۹۱۶ء نمبر ۶۶
بحوالہ انڈین مسلمز۔ اے ڈاکومنٹری ریکارڈ، جلد ۵ مرتبہ شان محمد، ۱۹۸۲ء میرٹھ

حاشیہ:
(۱) ترکی جرمن مشن ۲ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو کابل پہنچا تھا۔ اس مشن کے سربراہ راجہ مہندر پرتاب آف ہاتھرس (یوپی۔ انڈیا) تھے اور مولانا برکت اللہ آف بھوپال (جنوبی ہند) کاظم بیگ (ترکی) فون ہنٹس (جرمن) اور نیڈرمائر (آسٹریلیا) اس کے ارکان تھے۔ ۱۵۔ اکتوبر ۱۹۱۵ء کو مولانا عبید اللہ سندھی جب کابل پہنچے تو انھوں نے اس مشن سے تعلقات پیدا کرلیے اور جب آزاد ہندوستان کی عارضی حکومت کا قیام عمل میں آیا تو راجہ صاحب اس کے صدر، برکت اللہ وزیر اعظم اور مولانا سندھی وزیر داخلہ مقرر ہوئے۔ مشن کا مقصد افغانستان سے ہندوستان پر حملہ کرانا تھا۔ تاکہ انگریز فوجوں کو یورپین محاذوں کے بجائے ہندوستان کے محاذ پر مصروف رکھا جائے اور جرمن اور ترک فوجوں کو روس کے برخلاف

زیادہ جنگ کرنے کا موقع مل سکے اور افغانستان کے حملے سے برٹش ہندوستان کو آزاد کرایا جا سکے۔

اس متوقع جنگ کے خطرے سے جنوب مغربی ہند کے تاجروں اور کاروبار کرنے والوں میں جو بیشتر ملک کے غیر مسلم تھے، سخت سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ انگریزوں نے جنگ کا خطرہ دکھا کر ہندو مسلم منافرت پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس کے لیے بعض ہندوؤں کو استعمال کیا تھا۔ اس رپورٹ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

باب ششم :

بعض بزرگ شخصیات

ریشمی خطوط شازش کیس کے آئینے میں

ریشمی خطوط سازش کیس کے استغاثے کے متعدد دفعات میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن اور امام انقلاب مولانا عبید اللہ سندھی کے جرم حریت نوازی اور اسلام دوستی (تحریک اتحاد اسلامی سے ان کے تعلق خاص) کا ذکر آیا ہے اور پھر سازش کیس سے متعلق اشخاص کی ڈائریکٹری میں دونوں بزرگوں کا تذکرہ ہے۔ یہاں استغاثے سے متعلقہ دفعات اور تذکرے کے خاص خاص جملوں کو جو ۱۹۱۵ء تک کے حالات وافکار پر روشنی ڈالتے ہیں، مرتب کر دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اس مضمون میں جن دوسرے بزرگوں کا ذکر آیا ہے، ان کے بارے میں بھی ریشمی خطوط سازش کیس کی ڈائریکٹری سے سی آئی ڈی کی آرا اور ضروری معلومات کو مرتب کر دیا گیا ہے۔ (ا۔س۔ش)

(۱)

حضرت مولانا محمود حسن اور مولانا عبید اللہ سندھی

الف۔ ریشمی خطوط سازش کیس کا استغاثہ:(۱)

۴۔ سازشیوں نے ابتدا ہی میں سمجھ لیا تھا کہ عوام میں انتہائی تعصب وتشدد پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ان میں تبلیغ کرنے کے لیے مشنری تیار کیے جائیں۔ نیز یہ لوگ مولوی طبقے کے ہونے چاہییں۔ چناں چہ ہم نے دیکھا کہ سازش کے بانی مبانی مولوی عبید اللہ نے دیوبند میں مولویوں کے اہم مدرسے کا استعمال کیا۔ تاکہ یہ کہا جاسکے کہ سازش کی شروعات دیوبند سے ہوئی ہے۔ عبید اللہ نومسلم سکھ تھا۔ اس کا مذہبی جنون انتہا کو پہنچا ہوا تھا۔ اس نے خود بھی دیوبند میں تعلیم پائی تھی۔

۶۔ مدرسے میں عبید اللہ کا ضرر رساں اثر تیزی سے پھیلنے لگا اور اس نے مدرسے کے اساتذہ اور طلبہ میں بہت سے لوگوں میں اپنے باغیانہ خیالات بھر دیے اس نے مولانا محمود حسن کو اس سے پہلے ہی مکمل طور پر اپنا ہم خیال بنالیا تھا کہ مدرسے کے منتظمین مدرسے کو درپیش خطرات کا اندازہ کرسکیں اور عبید اللہ کو مدرسہ چھوڑنے پر مجبور کریں۔
مولانا (محمود حسن) کو ان کے تبحر علمی کی وجہ سے نیز علوم دینیہ کے عالم اور رہنما ہونے کے باعث جو شہرت حاصل تھی اس کی وجہ سے ان کو سازش کا علامتی سربراہ بنایا گیا تھا۔

۷۔ عبید اللہ کا منصوبہ تھا کہ مدرسے کو اپنے کام کا ہیڈ کوارٹر بنائے اور اتحاد اسلامی اور برطانیہ دشمنی کی تحریک کو ان سیکڑوں مولویوں سے کام لے کر پورے ہندوستان میں پھیلا دے، جو دیوبند کے مدرسے میں تعلیم پاکر مذہب اسلام کے پرچار اور تبلیغ کے لیے ہندوستان میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

---

(۱) اس ذیل میں پیراگرافوں پر جو نمبر پڑے ہوئے ہیں، یہ ریشمی خطوط سازش کیس کے استغاثے کی دفعات کے نمبر ہیں۔

۸۔ ..... عبید اللہ نے انگریزی تعلیم پائے ہوئے لوگوں مثلاً، انیس احمد بی اے، خواجہ عبد الحی اور قاضی ضیاء الدین بی اے کو مدرسے میں داخل کیا... ان اشخاص کو جمعیت الانصار کے فنڈ سے وظائف دیے جاتے تھے۔ مولوی مرتضیٰ حسن نے ہمیں بتایا کہ عبید اللہ نے جمعیت الانصار کے اندر ایک خفیہ جماعت بنائی تھی۔ یہ ایک قسم کا اندرونی حلقہ تھا، جس کے اغراض ومقاصد ظاہر نہیں کیے گئے تھے، لیکن رسواکن حد تک قابل اعتراض تھے۔ چناں چہ مدرسے کے سربراہ (شمس العلماء حافظ محمد احمد) نے موقع نکال کر مولوی عبید اللہ کو طلب کیا اور اس بارے میں سرزنش کی...

۱۳۔ برطانوی حکومت سے (مولانا محمود حسن کی) اس آزردگی پر (جوجنگ اٹلی وترکی اور بلقان کی جنگوں سے نیز کان پور کی مسجد کے واقعہ انہدام سے پیدا ہوئی تھی) وہ تلخی متزاد تھی، جو مولانا (محمود حسن) کے احساسات میں شمس العلماء حافظ محمد احمد مہتمم اور مولانا حبیب الرحمٰن نائب مہتمم مدرسہ کے رویے سے پیدا ہوئی تھی، یہ لوگ محسوس کرتے تھے کہ مولانا (محمود حسن) کی شخصیت کی عظمت کے باعث اور لوگوں میں مولانا محمود حسن کا جو احترام ہے، اس کی وجہ سے مدرسے میں ان لوگوں کا اثر کم ہوتا ہے۔ یوں مولانا (محمود حسن) ارباب اہتمام کے سنجیدہ اور دوستانہ مشوروں سے محروم ہو گئے اور مولانا عبید اللہ اور ابوالکلام آزاد وغیرہ کے مضر اثرات میں آگئے۔

۱۴۔ مدرسے کی نیک نامی کی بقا کے لیے مجلس منتظمہ نے فیصلہ کیا کہ عبید اللہ کو انیس احمد اور اس کے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ مدرسے سے خارج کر دینا چاہیے۔ مولانا (محمود حسن) نے اس فیصلے کو پسند نہیں کیا۔ وہ پہلے بھی مہتمم کی اس بات سے ناراض تھے کہ اس نے مولوی محمد میاں کو کسی قصور کی بنا پر مولانا (محمود حسن) سے مشورے یا انھیں اطلاع دیے بغیر دیوبند سے رخصت کر دیا تھا جو ان کے نزدیک (محمود حسن کی) شان کے خلاف تھا۔ مولانا محمد میاں اس لیے دیوبند بلائے گئے تھے کہ بعض کاموں میں مولانا (محمود حسن)

کی مدد کریں۔ لیکن بعد میں یہ نہایت سرگرم سازشی بن گئے تھے۔

۱۵۔ دیوبند سے عبید اللہ کے اخراج کے معنی یہ نہ تھے کہ اس کا وہاں آنا جانا بند ہو گیا تھا۔ کیونکہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مولانا (محمود حسن) کی نشست گاہ (بیٹھک) ستمبر ۱۹۱۵ء تک جب کہ مولانا ہندوستان سے حجاز روانہ نہ ہو گئے، سازشیوں کی جلسہ گاہ بنی رہی۔ عبید اللہ اور دوسرے لوگ مشوروں میں شریک ہونے کے لیے دیوبند آتے رہے۔

ب۔ سازش کیس کی متعلقہ ڈائریکٹری:

ا۔ ریشمی خطوط سازش کیس کی متعلقہ ڈائریکٹری میں بھی حضرت کا ذکر تفصیل سے آیا ہے۔ اس کے چند جملے یہ ہیں:

> "مولانا محمود حسن دیوبند کے صدر مدرس، پارسائی اور تقدس کے لیے مشہور ہیں۔ ان کے مرید جن میں سرکردہ مسلمان بھی ہیں، ہندوستان بھر میں ہیں۔ عبید اللہ کے اثر میں آنے سے ان کے خیالات تبدیل ہوئے۔ دیوبند میں ان کا مکان اتحاد اسلامی کے سازشیوں کا گڑھ تھا۔ انھی نے سیف الرحمن، فضل الٰہی، فضل محمود وغیرہ کو سرحد پار قبائلیوں کو جہاد پر بھڑکانے کے واسطے بھیجا تھا.... ہندوستان میں اتحاد اسلامی کی سازش میں مولانا کی رہنمایانہ اور قائدانہ شخصیت بڑی سرکردہ ہے"

۲۔ مولانا عبید اللہ سندھی کے بارے میں مذکورہ ڈائریکٹری میں ۱۹۱۵ء تک کی کارگزاری کے بارے میں یہ معلومات ہیں:

"عبید اللہ .... پہلے سکھ تھا۔ اس کا اصل نام بوٹا سنگھ ہے۔ چیاں والی ضلع سیالکوٹ کا رہنے والا ہے۔ اوائل عمر میں اسلام قبول کر لیا تھا۔ ابتدائی تعلیم سندھ میں پائی۔ پھر مدرسہ دیوبند میں داخل ہوا۔ تکمیل درس کی بعد اس نے بارہ برس سندھ میں گزارے۔ جہاں پیر جھنڈا اور نواب شاہ میں مدرسے قائم کیے۔ ۱۹۱۰ء میں دیوبند واپس آگیا۔ جہاں جمعیت الانصار قائم کی جنگ بلقان میں بڑے پیمانے پر ہلال احمر کے لیے روپیہ جمع کیا اور غیر ملکی مال کے بائی کاٹ

کی تبلیغ کر کے اہمیت وشہرت حاصل کرلی۔ بعد میں وہ دلی میں مقیم ہو گیا، جہاں اس نے نظارۃ المعارف القرآنیہ قائم کیا جس کا وہ اب بھی ناظم ہے۔ وہ مولانا ابوالکلام آزاد، قاضی ضیاء الدین، مولوی عبد القادر (دین پور پنجاب) شیخ عبد الرحیم (حیدر آباد سندھ) وغیرہ وغیرہ کا شریک کار رہے.... مولانا محمود حسن کا پکا مرید ہے اس نے مولانا (محمود حسن) پر اثر ڈالا اور بالآخر انھیں اتحاد اسلامی کا اتنا زبردست مبلغ بنا دیا۔ وہ دیوبند کے خفیہ مشوروں میں شریک ہوتا تھا۔" (۱)

(۲)

مولانا حبیب الرحمن عثمانی

نائب مہتمم دارالعلوم دیوبند

مولانا فضل الرحمن عثمانی کے بیٹے اور مولانا عزیز الرحمن عثمانی مفتی دارالعلوم اور مولانا شبیر احمد عثمانی مدرس دارالعلوم کے بڑے بھائی۔ ان کا ذکر ریشمی خطوط سازش کیس میں شمس العلماء حافظ محمد احمد کے ساتھ کئی بار آیا ہے۔ حضرت شیخ الہند کی سیاسی تحریک کی مخالفت اور انگریز پرستی میں دونوں بزرگ ہم خیال تھے۔ سازش کیس کی ڈائریکٹری میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

"حبیب الرحمن نائب مہتمم مدرسہ دیوبند... مولوی عبید اللہ اور مولانا محمود حسن کی اسکیموں میں شامل نہیں ہوا۔ اس کو وفادار سمجھا جاسکتا ہے۔"

---

(۱) ریشمی خطوط سازش کیس میں یہ ذکر بار بار آیا ہے کہ تحریک کی اصل شخصیت مولانا سندھی کی تھی اور انھوں نے مولانا محمود حسن کو متاثر کیا حالاں کہ واقعہ بالکل اس کے برعکس ہے۔ حضرت مولانا محمود حسن نے مولانا سندھی میں قومی وملی شعور پیدا کیا، سیاسی تربیت فرمائی جمعیت الانصار کے قیام میں ان کی رہنمائی فرمائی، اس کا ناظم بنوایا۔ پھر نظارۃ المعارف القرآنیہ (دہلی) کے قیام کے لیے تمام سروسامان فراہم کیا ملکی اور قومی مدبرین اور اہل سیاست سے ان کا تعارف کروایا اور پھر انھیں کابل بھیجا۔ اس لیے یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ تحریک کی اصل شخصیت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی تھی۔

(۳)

شمس العلماء مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دار العلوم

حضرت شمس العلماء حضرت قاسم العلوم والخیرات مولانا محمد قاسم نانوتوی کے صاحبزادے اور دار العلوم کے مہتمم۔ حضرت شیخ الہند کی سیاسی تحریک کے شدید مخالف تھے "ریشمی خطوط سازش کیس" میں انگریزوں کے وفادار کی حیثیت سے متعدد بار ان کا تذکرہ آیا ہے۔ سازش کیس کی متعلقہ ڈائریکٹری میں "مدرسہ" کے ضمن میں ان کے بارے میں لکھا ہے:

> "مدرسہ (دیوبند) کے پرنسپل شمس العلماء مولوی حافظ محمد احمد ہیں جو اس مدرسے کے مرحوم بانی (مولانا محمد قاسم) کے فرزند ہیں۔ وفادار اور شریف آدمی ہیں۔"

بعد کے صفحات میں "محمد احمد" کے ذیل میں بہ ایں الفاظ ان کا تعارف ہے:

> "شمس العلماء حافظ محمد احمد پسر محمد قاسم (نانوتوی) بانی مدرسہ دیوبند۔ یہ مدرسے کا مہتمم یا پرنسپل ہے اور وفادار ہے۔"

(۴)

مولانا شبیر احمد عثمانی مدرس دار العلوم (دیوبند)

مولانا شبیر احمد عثمانی کے بارے میں سازش کیس کی ڈائریکٹری میں خاص جملے یہ ہیں:

مطلوب الرحمٰن کے بھائی ہیں اور دیوبند کے مدرس ہیں دوسرے بھائی حبیب الرحمن اور مفتی عزیز الرحمن مدرسے کے عملے میں شامل ہیں۔ وہ بڑے فاضل مولوی ہیں ... شروع میں مولانا عبید اللہ کے ساتھ دوستی رکھتے تھے، لیکن بعد میں سخت دشمن ہوگئے۔ دیوبند سے ان کے اخراج کے خاص ذمہ دار وہی ہیں۔"

باب ہفتم:

ریشمی خطوط والے سازشی
(سڈیشن کمیٹی ۱۹۱۸ء کی رپورٹ کی روشنی میں)

حضرت شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی خود نوشت نقش حیات کے ایک حوالے میں سڈیشن کمیٹی ۱۹۱۸ء کی رپورٹ کا ذکر آیا ہے اور اس کا مختصر اقتباس نقل ہوا ہے۔ یہاں اس رپورٹ کی متعلقہ دفعات ۱۶۴تا ۱۶۶مکمل درج کی جاتی ہیں۔ ان کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم برطانوی حکومت کی نظر میں کیسی خطرناک شخصیت تھے اور حکومت شمالی ہند سے ان کے اثرات مٹانے پر کیوں تلی ہوئی تھی۔ اور یہ کہ شمس العلماء حافظ محمد احمد اور مولانا حبیب الرحمن عثمانی کا کارنامہ برطانوی حکومت کے مفاد کے نقطۂ نظر سے کس درجہ قابل ستائش تھا۔ لیکن یہ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ حکومت نے حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم کو تو ہر طرح نوازا لیکن مولانا حبیب الرحمٰن نائب مہتمم کی عظیم الشان خدمت کا اعتراف حیدر آباد کی ملازمت کے سوا شایان شان نہیں کیا۔ حال آں کہ نائب مہتمم کی خدمات مہتمم سے ہرگز کم نہ تھیں۔ دارالعلوم میں مولانا سندھی کے خلاف جو اعمال سازش انجام پائے تھے۔ ان کی پلاننگ حضرت نائب مہتمم ہی نے کی تھی (ا۔س۔ش)

چودھویں باب کا آخری حصہ

ریشمی خطوط والے سازشی

۱۶۴۔ مجاہدین کے طرف دار تعداد میں کم ہیں۔ لیکن ان کا حال بھی اس سلسلہ خط وکتابت کی ایک بہت ضروری کڑی ہے۔ جو وہ لوگ جنھیں ہم آیندہ "ریشمی خطوط والے سازشی" لکھیں گے ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ جاری کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

اگست ۱۹۱۶ء میں اس سازش کا انکشاف ہوا جو گورنمنٹ کے کاغذات میں "ریشمی خطوط کی سازش" کہلاتی ہے۔ یہ ایک تجویز تھی جو ہندوستان ہی میں تیار کی گئی تھی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ شمال مغربی سرحد سے ایک حملہ ہو، ادھر ہندوستان کے مسلمان اٹھ کھڑے ہوں اور سلطنت برطانیہ کو تباہ وبرباد کر دیا جائے۔ اس تجویز پر عمل کرنے اور اس کو تقویت دینے کے لیے ایک شخص مولوی عبید اللہ نے اپنے تین رفقا عبد اللہ، فتح محمد، اور محمد علی کو ساتھ لے کر اگست ۱۹۱۵ء میں شمال مغربی سرحد کو عبور کیا۔ عبید اللہ سکھ سے مسلمان ہوا ہے۔ اور صوبہ جات متحدہ کے ضلع سہارن پور میں مسلمانوں کے مذہبی مدرسہ دیوبند میں اس نے مولوی کی تعلیم پائی ہے۔ وہاں اس نے اپنے جنگی اور خلاف برطانیہ خیالات سے عملہ مدرسہ کے بعض لوگوں اور کچھ طلبہ کو متاثر کیا۔ اور سب سے بڑا شخص جس پر اس نے اپنا اثر ڈالا، وہ مولانا محمود حسن تھا، جو اسکول میں بہت دیر تک ہیڈ مولوی رہ چکا ہے۔ عبید اللہ چاہتا تھا کہ دیوبند کے مشہور مدرسے کے تعلیم یافتہ مولویوں کی رفاقت سے ہندوستان بھر میں ایک اسلامی جوش اور برطانیہ کے خلاف تحریک پھیلائے، لیکن اس کی تجاویز کے راستے میں مدرسے کے مہتمم اور انجمن کے لوگ سد راہ ہوئے۔ انھوں نے اسے اور اس کے چند ساتھیوں کو مدرسے کی ملازمت سے برخاست کر دیا۔ اس امر کا بھی ثبوت مل چکا ہے کہ وہ بعض حالات میں مصیبت میں گرفتار رہا۔ پھر بھی وہ مولانا محمود حسن کے پاس عام طور پر آتا رہا۔ مولانا کے مکان پر خفیہ جلسے

ہوتے رہے اور اس بات کی اطلاع ملی ہے کہ سرحد سے کچھ آدمی بھی وہاں آتے تھے۔

۱۸۔ ستمبر ۱۹۱۵ء کو محمود حسن نے بھی ایک شخص محمد میاں اور دوستوں کے ساتھ عبید اللہ کی مثال کی پیروی کی۔ اور شمال کی طرف جانے کے لیے نہیں بلکہ عرب کے صوبہ حجاز میں مقیم ہونے کی غرض سے ہندوستان چھوڑ دیا۔

روانہ ہونے سے پہلے عبید اللہ نے دہلی میں ایک مدرسہ قائم کیا اور دو ایسی کتابیں معرض اشاعت میں لایا۔ جن مین ہندوستانی مسلمانوں کو جنگی اور مذہبی جوش کی ترغیب دی گئی اور ان کو جہاد کے فرض اولیٰ کے ادا کرنے پر آمادہ کیا گیا تھا۔ اس شخص کا اور اس کے دوستوں کا جن میں مولانا محمود حسن بھی شامل ہیں۔ عام مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا ایک بہت زبر دست حملہ ہندوستان پر ہو اور مسلمانوں کی بغاوت سے اس کو تقویت پہنچے۔ اب ہم ذیل میں ان کوششوں کا ذکر کریں گے۔ جو ان لوگوں نے اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لیے کیں۔

عبید اللہ اور اس کے دوست پہلے ہندوستانی مجنونان مذہبی کے پاس گئے اور اس کے بعد کابل پہنچے۔ وہاں وہ ترکی جرمن مشن کے ممبروں سے ملے اور ان سے تبادلہ خیالات کیا اور تھوڑے عرصے کے بعد ان کا دیوبندی دوست مولوی محمد میاں انصاری بھی آن ملا۔ یہ آدمی مولانا محمود حسن کے ساتھ عرب گیا تھا اور ۱۹۱۶ء میں وہ اعلان جہاد ساتھ لے کر آیا، جو حجاز کے ترکی فوجی حاکم غالب پاشا نے مولانا محمود حسن کو دیا تھا۔ اثنائے راہ میں محمد میاں اس تحریر (جو غالب نامے کے نام سے مشہور رہے) کی نقلیں ہندوستان اور سرحدی قوموں میں تقسیم کرتا ہوا آیا۔ عبید اللہ اور اس کے ساتھی سازشی لوگوں نے ایک تجویز تیار کی تھی کہ جب سلطنت برطانیہ کو مٹا دیا جائے تو ہندوستان میں ایک عارضی حکومت قائم کی جائے۔ ایک شخص مہندر پرتاب اس کا پریذیڈنٹ ہونے والا تھا۔ یہ شخص ایک اچھے خاندان کا ہندو اور خودرائے اور وہمی سیرت کا آدمی

ہے اور ۱۹۱۴ء میں اسے اٹلی، سوئٹزرلینڈ اور فرانس میں سفر کرنے کا پروانہ راہداری دیا گیا تھا۔ وہ سیدھا جنیوا کو گیا۔ وہاں ہردیال سے ملا اور ہردیال نے اس کا جرمن قونصل سے تعارف کرادیا۔ اس کے بعد برلن چلا گیا۔

ایک شخص جو عبید اللہ کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اس کی نسبت وہ لکھتا ہے کہ وہ شخص تجویزیں تیار کرنے میں بہت عجیب اور غیر معمولی آدمی تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بہت بڑی سلطنت کا حکمران ہے۔ مگر جہاں کام کرنے کا وقت آجائے تو وہ بہت سست تھا اور کام کرنے سے جی چراتا تھا۔ .....اور وہاں سے کسی خاص مشن کے لیے بھیج دیا گیا۔ کیوں کہ اس نے جرمنوں پر اپنی اہمیت کا اثر مبالغہ آمیز طریق پر ڈالا تھا۔

خود عبید اللہ ہندوستان کا وزیر ہونے والا تھا۔ اور کرشنا ورما کا دوست اور امریکن غدر پارٹی کا ممبر برکت اللہ، جس نے برلن کے راستے کابل کا سفر کیا تھا۔ وزیر اعظم ہونے والا تھا۔ یہ شخص ریاست بھوپال کے ایک ملازم کا بیٹا تھا۔ اور انگلستان، امریکہ اور جاپان ہو آیا تھا۔ یہ شخص ٹوکیو میں ہندوستانی (زبان) کا پروفیسر مقرر ہوا تھا اور وہاں اس نے برطانیہ کے خلاف ایک نہایت تیز اخبار اسلامک فریٹرنٹی کے نام سے جاری کر رکھا تھا۔ اس اخبار کو بعد میں جاپانی حکام نے بند کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے عہدے سے موقوف کر دیا گیا اور پھر امریکہ جاکر وہ اپنے غدری دوستوں سے مل گیا۔

وہ جرمن جو افغانستان میں اپنے مقاصد کے لیے آئے تھے، جب ناکام رہے تو ۱۹۱۶ء میں واپس چلے گئے، مگر ہندوستانی وہیں رہے اور "حکومت عارضی" والوں نے روسی ترکستان کے حاکم اور زار روس کو اس مضمون کے خطوط لکھے کہ روس کو چاہیے کہ برطانیہ کلاں کے اتحاد کو خیر باد کہہ کر ہندوستان سے سلطنت برطانیہ کو مٹادینے کی کوشش میں امداد کرے۔ ان خطوط پر مہندر پرتاب کے دستخط تھے۔ آخر یہ خطوط برطانیہ کے ہاتھ آگئے۔ شہنشاہ روس کے نام جو خط تھا، وہ سونے کے پترے پر لکھا گیا تھا۔ جس کی عکسی

تصویر ہمیں دکھائی گئی ہے۔

"حکومت عارضی" نے ترکی گورنمنٹ کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی تجویز بھی کی اور اس مقصد کے حصول کے لیے عبید اللہ نے اپنے پرانے دوست مولانا محمود حسن کو خط لکھا۔ یہ خط ایک اور خط مورخہ ۸۔ رمضان مطابق ۹۔ جولائی ۱۹۱۶ء کے ساتھ جو محمد میاں انصاری نے لکھا تھا۔ بند کر کے اس نے حیدر آباد سندھ کے شیخ عبد الرحیم کے نام ایک نوٹ لکھ کر بھیج دیا۔ یہ شخص اس وقت مفقود الخبر ہے۔ شیخ عبد الرحیم سے اس نوٹ میں یہ التجا کی گئی تھی کہ وہ کسی معتبر حاجی کے ہاتھ وہ خطوط مکہ میں مولانا محمود حسن کو پہنچا دے۔ وہ خطوط زرد ریشمی کپڑے پر بہت صاف اور خوشخط لکھے ہوئے ہیں۔ محمد میاں کے خط میں یہ باتیں لکھی تھیں؟ جرمن اور ترک وفود کا آنا' جرمنوں کا واپس چلے جانا' ترکوں کا بغیر کسی کام کے رہ جانا' غالب نامے کی اشاعت 'حکومت عارضی کی تجویز اور خدائی فوج کی مجوزہ ساخت۔

اس فوج کی نسبت یہ تجویز تھی کہ اس کے لیے ہندوستان سے رنگروٹ بھرتی کیے جائیں اور مسلمان حکمرانوں کے درمیان اتحاد پیدا کیا جائے۔ محمود حسن ان تمام معاملات کو حکومت عثمانی تک پہنچانے پر مقرر تھا۔ عبید اللہ کے خط میں خدائی فوج کی تجویز کا ایک نقشہ تھا۔ اس فوج کا ہیڈ کوارٹر مدینہ اور اس کا جنرل انچیف محمود حسن ہونے والا تھا۔ دوسرے ہیڈ کوارٹر مقامی جرنیلوں کے ماتحت قسطنطنیہ 'طہران اور کابل میں قائم ہونے والے تھے۔ کابل میں خود عبید اللہ جرنیل مقرر ہونے والا تھا۔ اس نقشے میں تین سرپرستوں' ۲ فیلڈ مارشلوں اور بہت سے اور اعلیٰ فوجی افسروں کے نام تھے۔ لاہور کے بھاگے ہوئے طالب علموں میں سے ایک میجر جنرل 'ایک کرنل اور چھ لیفٹننٹ کرنل ہونے والے تھے۔ جو اشخاص ان اعلیٰ عہدوں کے لیے منتخب کیے گئے تھے۔ ان میں سے اکثر ایسے تھے۔ جن سے ان کے تقرر کی نسبت 'مشورہ نہیں لیا گیا تھا۔ لیکن ریشمی خطوط سے جو اطلاعات ملیں۔ ان میں بعض تدارک ضروری تھے

اور وہ کیے گئے۔

دسمبر ۱۹۱۶ء میں مولانا محمود حسن اور ان کے چار رفقا برطانیہ کے ہاتھ آ گئے۔ وہ اس وقت جنگی قیدی ہیں اور برطانیہ کی سلطنت کے ایک حصے میں نظر بند ہیں۔ غالب پاشا بھی جس نے "غالب نامہ" پر دستخط کیے تھے۔ آج کل جنگی قیدی ہے اور وہ اس امر کا اقبال کرتا ہے کہ اس نے اس کاغذ پر دستخط کیے تھے جو محمود حسن پارٹی نے اس کے روبرو پیش کیا تھا۔ اس کے ضروری حصوں کا ترجمہ یوں ہے:

> "ایشیا، یورپ اور افریقہ کے مسلمان ہر قسم کے اسلحہ سے آراستہ ہو کر خدا کی راہ میں جہاد کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ خدائے قادر وقیوم کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین دشمنان اسلام پر غالب آ گئے ہیں... اس لیے اے مسلمانو! اس ظالم عیسائی حکومت پر حملہ کر دو۔ جس کی قید میں تم پڑے ہو.... بہت جلد عزم صمیم سے اپنی تمام کوششوں کو دشمن کے مار ڈالنے کے لیے وقف کر دو اور ان سے نفرت و دشمنی ظاہر کرو۔ تمھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مولوی محمود حسن (جو پہلے ہندوستان کے مدرسہ دیوبند میں تھے) ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم سے مشورہ لیا۔ ہم نے اس خیال میں ان کی تائید کی اور انھیں ضروری ہدایات دے دی ہیں۔ اگر وہ تمھارے پاس آئیں تو تم ان پر اعتماد کرو اور آدمیوں، روپے اور ہر چیز سے جو وہ طلب کریں ان کی امداد کرو۔"

نتیجہ

۱۶۵۔ اس باب میں جو واقعات لکھے گئے ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہے کہ چند مسلمان مذہبی مجنون ہندوستان میں بغاوت پھیلانے کے کس قدر خواہشمند تھے اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہونے کے لیے انھوں نے برطانیہ کے دشمنوں کے ساتھ اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جنگ برپا کرنے کے لیے ان کے طریقے یہ ہیں کہ پہلے خفیہ اور پراسرار سازشیں اور تجاویز کی جائیں

اور پھر آشکارا طور پر فساد کھڑا کیا جائے، کبھی وہ رنگروٹ بھیجتے ہیں، کبھی چندے جمع کرتے پھرتے ہیں، کبھی روپیہ بھیجتے ہیں، کبھی وہ خود جاتے ہیں۔ وہ ہمیشہ بغاوت کا وعظ کرتے ہیں۔ ان کی تجاویز سے محفوظ رہنے کے لیے عام مسلمانوں کی وفاداری اور گورنمنٹ کی طاقت کا رعب واثر ہی دو ذریعے ہیں۔

پندرھواں باب
ان تمام سازشوں کی ہیئت اور ان کی ناکامی

۱٦٦۔ اب ہم نے ان تمام سازشوں کی تحقیقات کرلی ہے۔ جو تحریک انقلاب سے تعلق رکھتی ہیں۔ بمبئی میں یہ لوگ خالص برہمن اور زیادہ تر چت پون ہیں۔ بنگال میں سازشی لوگ متوسط طبقے کے نوجوان آدمی ہیں۔ ان کے اپنے صوبے میں ان سازشوں سے قتل اور ڈاکوں کا ایک سلسلہ شروع ہوگیا۔ بہار اڑیسہ، صوبہ جات متحدہ، صوبہ جات متوسط اور مدراس میں ان سازشوں نے جڑ تو نہیں پکڑی۔ مگر کبھی کبھی جرم وبدامنی کا باعث ضرور ہوتی ہیں۔ پنجاب میں امریکہ کے جو تارکین وطن واپس آئے، وہ بغاوت وخونریزی پر تلے ہوئے تھے۔

انھوں نے بہت سے جرائم کیے۔ اور ۱۹۱۵ء کی سازش غدر کا باعث ہوئے۔ برہما میں بھی تحریک غدر بہت سرگرمی سے کی جارہی تھی، مگر اس کے محرک گرفتار کرلیے گئے۔

اخیر میں مسلمانوں کی ایک سازش کا انکشاف ہوا، جو چند مذہبی دیوانوں تک محدود تھی اور ان کا ارادہ یہ تھا کہ باہر کے ملکوں کی مدد سے سلطنت برطانیہ کو مٹا ڈالیں۔ یہ تمام سازشیں ایک ہی مقصد کے لیے کی گئیں کہ ہندوستان سے

سلطنت برطانیہ کو زبردستی اٹھا دیا جائے۔ کبھی تو یہ جدا گانہ رہیں کبھی ان کو باہمی طور پر ملایا گیا۔ کبھی جرمن اثر سے ان کی ہمت افزائی کی گئی۔ لیکن ہندوستان کی وفاداری کی مدد سے ان سب مصیبتوں کا کامیاب مقابلہ کیا گیا۔ لیکن یہ کچھ بھی تعجب انگیز بات نہیں ہے کہ اس قسم کی سازشوں کے معاملے میں جو نہایت حزم واحتیاط سے کی گئی ہوں۔ گورنمنٹ غیر معمولی قوانین بنانے پر مجبور ہوگئی۔ آئندہ باب میں ہم بتائیں گے کہ اچھے زمانے میں جو قواعد وضوابط بنائے گئے تھے۔ وہ ایسے حالات میں ناکام کیوں رہے، جو بعض سازشوں سے پیدا ہو گئے تھے۔

نوٹ:

پچھلے صفحات میں جس سڈیشن کمیٹی کا ذکر آیا ہے وہ گورنمنٹ آف انڈیا کے ہوم ڈپارٹمنٹ کے ایک رزولیوشن نمبر ۲۸۸۱۰ مورخہ ۴۔ دسمبر ۱۹۱۷ء دہلی کے مطابق قائم کی گئی تھی۔ اس کے قیام کے دو مقاصد بیان کیے گئے تھے:

۱۔ ہندوستان میں سیاسی انقلاب کی تحریکوں کے متعلق مجرمانہ سازشوں کی اصلیت اور وسعت کے بارے میں تحقیقات کر کے رپورٹ مرتب کرے گی۔

۲۔ اس قسم کی سازشوں کی تفتیش میں جو مشکلات پیدا ہوتی رہتی ہیں، ان پر غور وخوض کرے گی اور اگر ضروری ہوا تو مناسب قانون وضع کرنے میں بھی اپنی رائے دے گی، جس سے گورنمنٹ ایسی سازشوں کا کماحقہ انسداد کر سکے۔"

اس کمیٹی کی صدارت کے لیے گورنمنٹ نے ہز میجسٹی کی ہائی کورٹ آف جسٹس کے کنگز بنچ ڈویژن کے جسٹس ایس۔ اے۔ ٹی رولٹ کی خدمات حاصل کی گئیں تھیں اس کمیٹی کے ارکان یہ حضرات تھے:

۱۔ سر باسل اسکاٹ کے۔ ٹی چیف جسٹس بمبئی

۲۔ دیوان بہادر سی۔ وی کمار سوامی شاستری جج ہائی کورٹ مدراس

۳۔ سرورنے لووٹ کے۔ سی۔ ایس۔ آئی ممبر بورڈ آف ریوینو صوبجات متحدہ

۴۔ مسٹر پرواش چندر متر وکیل ہائی کورٹ کلکتہ وایڈیشنل لیجسلیٹو کونسل بنگال

اس کمیٹی کے سیکرٹری کے فرائض مسٹر جے۔ ڈی۔ وی۔ ہاج، آئی۔ سی۔ ایس بنگال نے انجام دیے ہے۔

جنوری ۱۹۱۸ء اس کمیٹی نے اپنے کام کا آغاز لیا اور چند ماہ کے اندر اپنا کام پورا کر کے رپورٹ پیش کردی۔ کمیٹی کی سفارش کے مطابق فروری ۱۹۱۹ء لیجسلیٹو کونسل میں ایک بل پیش کیا گیا اور بعد میں اسے پاس کردیا گیا۔ یہ بل اور قانون رولٹ بل اور رولٹ ایکٹ کے نام سے مشہور ہوئے۔ مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ سڈیشن کمیٹی کے قیام، تحقیقات سے نتائج کی تخریج اور وضع ونفاذ قانون (ایکٹ) کے پس منظر میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا عبید اللہ سندھی کے انقلابی مساعی کو بہت دخل تھا۔ یہاں سے تاریخ آزادی وطن کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے اس دور کی رہنمائی میں بھی حضرت شیخ الہند کی انقلابی جماعت کا سب سے زیادہ حصہ تھا۔

○☆○

ضمیمہ اول

غالب نامہ

سڈیشن کمیٹی کی رپورٹ میں نمبر ۱۶۴ کے آخر میں "غالب نامہ" کے بعض حصوں کا ترجمہ دیا گیا ہے لیکن یہ ترجمہ پہلے انگریزی میں اور پھر اردو میں ترجمہ ہوکر اور پھر اس کی تلخیص کرنے کی کوشش میں صحت مطالب وزبان سے بہت دور ہوگیا ہے۔ اس لیے اس مقام پر غالب نامہ کا مکمل اردو ترجمہ "تحریک شیخ الہند مرتبہ مولانا سید محمد میاں" سے اخذ کر کے شامل کر دیا جاتا ہے۔ غالب نامہ کا اردو ترجمہ اصل عربی اور ترکی تحریر کے مطابق اس طرح ہے:

نقل فرمان غالب پاشا گورنر حجاز شریف

قائم مقام (نمائندہ) اعلیٰ حضرت خلیفہ رسول رب العالمین، امیر المومنین دام اقبالہ

یہ بات کسی پر مخفی نہیں ہے کہ جنگ عمومی گذشتہ ایک سال سے ترکی کی اسلامی حکومت کا رخ کیے ہوئے ہے۔ روس فرانس اور انگریز (دشمنان اسلام) ممالک عثمانیہ پر بری و بحری حملے کر رہے ہیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر حضرت امیر المومنین وخلیفت المسلمین نے محض اللہ کی نصرت اور خاتم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روحانی طاقت کے بھروسہ پر جہاد مقدس کا اعلان کر دیا ہے جس کے جواب میں ایشیا یورپ اور افریقہ کے مسلمانوں نے لبیک کہا ہے اور ہر قسم کے ہتھیاروں سے لیس ہوکر میدان جنگ میں کود پڑے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ ترکی فوج اور مجاہدین کی تعداد دشمنان اسلام کی تعداد

سے بڑھ گئی ہے اور انھوں نے دشمنوں کی قوت کو مادی اور اخلاقی طور پر کمزور کر دیا ہے۔

چناں چہ روسیوں کی فوج کا ایک بڑا حصہ قفقازیہ میں تباہ کر دیا گیا ہے اور ایک لاکھ برطانوی اور فرانسیسی فوج اور ان کے جنگی جہاز درہ دانیال اور دوسرے مقامات پر برباد کر دیے گئے ہیں۔ ترکوں، جرمنوں اور آسٹریوں نے مشرق میں روسیوں کو اور مغرب میں فرانسیسیوں اور بلجیکیوں کو پیچھے دھکیل دیا ہے۔ ایک تہائی روسی اور فرانسیسی علاقے اور سارے بلجیم اور لاکھوں رائفلوں، بندوقوں اور دوسرے سامان جنگ پر قبضہ کر لیا ہے اور ہزاروں فوجیوں کو قیدی بنا لیا ہے۔ اب بلغاریہ بھی مرکزی قوتوں کے ساتھ شریک ہو کر جنگ میں شامل ہو گیا ہے اور اس نے سربیا کے علاقہ میں اندر تک گھس کر وہاں کے لوگوں کو شکست فاش دے دی ہے۔ اس لیے میرا یہ پیغام میرے سلام کے ساتھ ان مسلمانوں کو پہنچا دیا جائے جو ان حکومتوں کی غلامی میں ہیں کہ وہ اب مکمل طور پر شکست کھا چکی ہیں اور اب بالکل لاچار و بے یار و مددگار ہیں اور ان کے یعنی مسلمانوں کے سامنے جس قوت و طاقت کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے، وہ محض خیالی ہے۔

مسلمانو! آج تمھاری نجات کا دن ہے۔ اس لیے اب اپنی ذلت و خواری اور اپنی غلامی پر راضی و قانع نہ رہو۔ بلاشبہ آزادی کامیابی، فتح و نصرت تمھارے ساتھ ہے۔ اب خواب غفلت سے بیدار ہو اور متحد ہو کر اپنے اندر تنظیم و اتحاد پیدا کرو۔ اپنی صفوں کو درست کرو اور اپنے آپ کو ان چیزوں سے لیس کرو جو تمھارے لیے ضروری اور کافی ہوں اور پھر اس ظالم و جابر عیسائی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہو۔ جس کی غلامی کا کمزور طوق تمھاری گردنوں میں پڑا ہوا ہے۔ اس زنجیر غلامی کو اپنے مذہب کی طاقت اور دین کی تیز دھار سے کاٹ ڈالو۔ اس طرح اپنے وجود اور انسانی آزادی کے حقوق کو حاصل کر لو۔ ہم ان شاء اللہ عنقریب مکمل فتح اور کامیابی کے بعد معاہدے کریں گے تو

تمہارے حقوق کی پوری طرح حفاظت ومدافعت کریں گے۔

اس لیے اب جلدی کرو اور پختہ عزم وارادہ کے ساتھ دشمن کا گلا گھونٹ کر اسے موت کے منہ میں پہنچا دو اور اس سے نفرت ودشمنی کا مظاہرہ کرو۔ ہم تمہاری طرف بھروسے اور اعتماد کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس لیے یہ اچھا موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دو۔ بددل نہ ہو اور خداوند بزرگ وبرتر سے دلی مراد پوری ہونے کی امید رکھو۔ تمھیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ مولانا محمود حسن صاحب (جو پہلے دیوبند (ہندوستان) کے مدرسہ میں تھے) ہمارے پاس آئے اور ہم سے مشورہ طلب کیا۔ ہم اس بارے میں ان سے متفق ہیں اور ان کو ضروری ہدایات دے دی ہیں۔ ان پر اعتماد کرو اگر وہ تمہارے پاس آئیں تو روپیہ سے، آدمیوں سے اور جس چیز کی انھیں ضرورت ہو اس چیز سے ان کی مدد کرو۔

(دستخط) غالب (پاشا) والی حجاز

ایک خودساختہ
داستان

حقائق کے آئینے میں

I

از

حضرت مولانا سید اسعد مدنی
صدر عالمی موتمر و جمعیت علمائے ہند

ناشر

شعبہ نشر و اشاعت عالمی موتمر ابنائے قدیم دار العلوم دیوبند

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

امابعد!

مجروح ہورہی ہیں وفاداریاں تو کیا
کیسے ہر ایک بات پہ کہہ دوں بجا کہا

چند ایام ہورہے ہیں کہ دفتر اہتمام دارالعلوم دیوبند کی جانب سے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مدظلہ مہتمم دارالعلوم دیوبند کا ایک ہشت ورقی کتابچہ "ایک خود ساختہ داستان کی حقیقت" کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔ بعض ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ اس سے پہلے یہ رسالہ "ماہنامہ دارالعلوم" میں بھی چھپ چکا ہے۔ اس کتابچہ میں حضرت مہتمم صاحب نے احقر کی تقریر کے کچھ اجزا پر نقد و گرفت فرمائی ہے، یہ تقریر ۹۔ شوال سنہ ۱۴۰۰ھ کو دیوبند میں کل ہند موتمر ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کے اجلاس کے موقع پر ہوئی تھی۔ چوں کہ یہ اجلاس عالمی موتمر کی طرف سے ہورہا تھا جو ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کی ایک آزاد تنظیم ہے، اس لیے موقع کی مناسبت سے فرزندان دارالعلوم کی اولین تنظیم 'جمعیت الانصار' کا ذکر اس میں آگیا، جو حضرت مولانا عبیداللہ سندھی رحمت اللہ علیہ کی زیر نظامت سنہ ۱۳۲۷ھ مطابق سنہ ۱۹۰۹ع میں قائم ہوئی تھی، جس نے مولانا سندھی مرحوم کے حسن عمل،

حسن انتظام اور حسن کردار سے تھوڑے ہی دنوں میں اچھی خاصی مقبولیت اور وسعت اختیار کرلی تھی، لیکن بدقسمتی سے دارالعلوم کے ارباب بست وکشاد لے برداشت نہ کرسکے اور تنظیم کے روح رواں حضرت مولانا سندھی رہ کو مختلف حیلوں سے دارالعلوم سے الگ کرکے اس چڑھتی اور بڑھتی ہوئی تنظیم کو دبا دیا گیا۔

ویسے تو اپریل سنہ ۱۹۸۰ء ہی سے دسیوں نام نہاد پرچوں اور لاتعداد کتابچوں اور مسلسل بیانات کے ذریعہ ناقابل یقین وتصور جھوٹے الزامات، سوقیانہ اور عامیانہ تحریروں کا سلسلہ جاری ہے جس پر دارالعلوم کا بے حساب سرمایہ بہایا جارہاہے اور مولانا محمد سالم صاحب (صاحب زادہ حضرت مہتمم صاحب مدظلہ) کی زیر قیادت چند مفاد پرستوں کا یہ گروہ اتنی نیچی سطح پر اتر آیا ہے جس کا سارا ہندوستان تماشا دیکھ رہاہے اور ان کے داماد کی زیر نگرانی دہلی کا رابطہ دفتر مہینوں سے اس طرح کی خدمات انجام دے رہاہے، لیکن یہ تردیدی مضمون براہ راست حضرت مہتمم صاحب کے نام سے دفتر اہتمام دارالعلوم نے شائع کیاہے، جس میں اس حقیر کو ساب الموتیٰ، طاعن، دارالعلوم کا رقیب، داستان ساز، بہتان طراز، افسانہ نگار، تاریخ کا مسخ کنندہ اور نفسانی جیسے خطابات سے نوازا گیاہے۔ علاوہ ازیں اس میں بعض ایسی باتیں تحریر کی گئی ہیں جن کا تاریخ کی روشنی میں جائزہ لینا نہایت ضروری ہے تاکہ وہ حقائق ابھر کر سامنے آجائیں جن پر اس مقالہ کے ذریعہ پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اس مضمون میں میری تقریر کا جو حوالہ پانچ سطروں میں نقل کیا گیاہے، وہ کہاں تک صحیح اور درست ہے، اس بحث کو ابھی یہیں چھوڑیے، سردست اس خودساختہ خلاصہ کو سامنے رکھ کر جو اعتراضات قائم کیے گئے ہیں اور تقریر میں بیان کیے گئے واقعات کو تاویلوں کے دبیز پردے میں جس طرح چھپادینے کی کوشش کی گئی ہے، اس کا جائزہ لیتے چلیں، اس مقالہ میں کہا گیاہے کہ اسعد

نے اپنی تقریر میں "جمعیت الانصار" کے قیام کی نسبت مولانا عبید اللہ سندھی کی جانب کی ہے، پھر اس پر نقد کرتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

"یہ دعوی اس حد تک قابل تسلیم ہے کے موتمر الانصار کا یہ فکر اولاً مولانا سندھی کہ دماغ میں آیا....

...لیکن اس حد تک غلط ہے کہ جمعیت مولانا سندھی نے قائم کی، بلکہ جمعیت انھیں بزرگوں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ، حضرت مولانا محمد احمد صاحب، حضرت مولانا حبیب الرحمان صاحب عثمانی رحمہم اللہ نے مولانا عبید اللہ سندھی کے اظہار خیال پر باہمی تبادلہ خیال سے خود دارالعلوم میں قائم کی۔" (داستان کی حقیقت ص ۴، ۵)

اول تو یہ تقریر کی بات ہے ممکن ہے احقر نے قیام کی نسبت حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی جانب کی ہو یا کسی کا نام نہ لیا ہو نیز تقریروں میں حشو و زوائد کا پایا جانا عین ممکن ہے جو چنداں قابل گرفت نہیں۔ پھر قید تحریر میں نہ ہونے کی بنا پر آیندہ کے لیے اس کا ریکارڈ بھی محفوظ نہیں رہتا. با ایں ہمہ اگر ایسا کرنا قابل گرفت جرم ہے تو نہایت ادب کے ساتھ عرض ہے کہ

ایں گناہیست کہ در شہر شما نیز کنند

ذرا مختصر تاریخ دارالعلوم کا مطالعہ فرمالیں حضرت مہتمم صاحب مولانا سندھی مرحوم کے حالات زندگی لکھتے ہوئے تحریر فرمارہے ہیں:

"دارالعلوم میں آپ نے (مولانا سندھی نے) جمعیت الانصار قائم کی جس کے دو بڑے بڑے اجلاس مراد آباد اور میرٹھ میں ہوئے، آپ دارالعلوم کو ایک علمی انداز سے ملی تنظیم کا مرکز بنانا چاہتے تھے، جس کا نقش اول جمعیت الانصار تھا۔" (مختصر تاریخ دارالعلوم)

سوال یہ ہے کہ جس بات کو خود مہتمم صاحب تقریباً سترہ اٹھارہ سال قبل تاریخی انداز میں سپرد قلم فرما چکے ہیں، آج اسی بات کی خود انھیں اس شد و مد کے

ساتھ تردید وانکار کی کیوں ضرورت پیش آگئی، کیا اس بیان سے فضلا کے تشکیل تنظیم کے فطری حق کا اثبات تو نہیں ہو رہا ہے جسے مہتمم صاحب کسی قیمت پر دینے کے لیے تیار نہیں ہیں ؟

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی کو دارالعلوم دیوبند سے کیوں الگ کیا گیا، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں :

> "ان کی (مولانا عبید اللہ سندھی کی) علاحدگی جمعیت الانصار کو ختم کرنے کی بنا پر قطعاً نہ تھی بلکہ اختلاف فکر ونظر اور بعض فروعی اختلافات کی بنا پر ہوئی جو پورے حلقہ دارالعلوم میں تشویش کی نگاہوں سے دیکھے جا رہے تھے۔" (داستان کی حقیقت، ص 66)

مولانا سندھی مرحوم کی دارالعلوم سے علاحدگی کا قضیہ نامرضیہ جس زمانہ میں پیش آیا تھا بقول خود مہتمم صاحب اس وقت نوعمر تھے علمی مباحث کو سمجھ نہ پاتے تھے، اس کے برعکس مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم جنھیں مہتمم صاحب نے اسی رسالہ میں حضرت شیخ الہند کے مخصوص تلامذہ میں شمار کیا ہے (ص ۷) اس وقت دارالعلوم میں دورہ حدیث کے طالب علم تھے اور ادارہ اہتمام کے معتمد بھی، اور اس واقعہ کے عینی شاہد بھی، انھوں نے اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے وہ مہتمم صاحب کی تحقیق کے خلاف ہے، وہ لکھتے ہیں :

> "دوسری بات جسے اسی سلسلے کی ایک کڑی سمجھنی چاہئے یعنی مولوی عبید اللہ سندھی اور ارباب مدرسہ کی کشیدگی پھر بھی باقی رہی اور یہ مسئلہ بھی واضح ہوتا چلا گیا کہ حضرت شیخ الہند اور مولوی عبید اللہ دونوں کا زاویہ خیال مدرسہ کے ارباب بست وکشاد سے جدا ہوتا چلا جاتا ہے تبلیغ والا مسئلہ تو خیر ایک علمی مسئلہ تھا، درحقیقت ان دونوں صفوں میں حقیقی اختلاف سیاسی طریقہ عمل کے متعلق تھا۔"
> (ماہنامہ دارالعلوم، جمادی الثانی سنہ ۱۳۷۲ھ، ص ۴۲)

مہتمم صاحب اس علاحدگی کی وجہ بعض فروعی اختلافات کو قرار دے رہے ہیں، لیکن واقعہ کے عینی مشاہد مولانا گیلانی کی زبانی ابھی آپ نے سن لیا کہ علمی مسئلہ تو برائے بیت تھا، اس کا اصلی اور حقیقی سبب سیاسی طریقہ عمل سے متعلق تھا، اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں حضرت شیخ الہند مولانا سندھی کے نہ صرف ساتھ تھے بلکہ ان کے اندر قومی سیاست کا جذبہ پیدا کرنے والے خود حضرت شیخ الہند ہی تھے، لیکن نزلہ ہمیشہ عضو ضعیف ہی پر گرتا ہے، اس لیے غریب ومظلوم مولانا سندھی کو نشانہ بنایا گیا اور انھیں مادر علمی کے سایہ سے ہمیشہ کے لیے محروم کر دیا گیا، حتی کہ موصوف کو دہلی میں پناہ لینی پڑی۔ مگر حضرت شیخ الہند پر براہ راست ہاتھ ڈالنے کی جرات نہیں ہوئی۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ نے تو اس سلسلے میں عجیب انکشاف فرمایا ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ مولانا سندھی مرحوم کو دارالعلوم سے الگ خود برطانوی گورنمنٹ کے اشارے پر کیا گیا اور اسی کارنامہ پر اس وقت کے مہتمم صاحب کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازا گیا۔ حضرت شیخ الاسلام قدس سرہ لکھتے ہیں:

"بہر حال اصلی سبب وہ امر ہے جس کی بناپر مسٹن گورنر یوپی، دیوبند میں گیا تھا اور مہتمم صاحب کو شمس العلماء کا خطاب ملا تھا" (نقش حیات ص ۲۴۰، ج ۲ حاشیہ)

اس کی مزید تصدیق لندن سے حاصل شدہ ریکارڈ متعلقہ ریشمی خطوط سازش کیس سے بھی ہوتی ہے۔ حکومت برطانیہ کا سی، آئی، ڈی "جمعیت الانصار" کے متعلق رپورٹ میں لکھتا ہے:

ابتدا میں دیوبند کے مدرسہ کی ساری مجلس منتظمہ جمعیت الانصار کے حق میں تھی، جلد ہی عبید اللہ نے انگریزی پڑھے ہوئے نوجوانوں کو طالب علم بھرتی کرنا شروع کر دیا، اس پر ادارہ نے نیم سیاسی نوعیت اختیار کرلی، جب جنگ بلقان شروع ہوئی اور دیوبند کے ذمہ داروں نے ترکی کی مالی امداد کے جواز کا فتوی جاری کر دیا تو اچانک جمعیت الانصار اپنے اصلی رنگ میں آگئی۔ اور انتہائی

متعصب سیاسی جماعت بن گئی مولوی طلبہ اور دوسرے لوگ مبلغ بناکر بھیجے جانے لگے اور ترکی کی مدد کے لیے ہلال احمر کے فنڈ میں بڑی بڑی رقمیں جمع کی جانے لگیں ،غیر ملکی سامان کے بائیکاٹ کی تبلیغ بڑے شد ومد سے کی گئی اس کی شاخ قاسم المعارف نے کلکتہ میں چندہ جمع کرنے کے سلسلے میں بہت کافی سرگرمی دکھائی، اس پر مدرسہ کے سنجیدہ لوگ چوکنے ہوئے اور ایسے اختلافات پیدا ہوئے کہ عبید اللہ کو سنہ ۱۹۱۳ء میں استعفی دینا پڑگیا اور جلد ہی اس ادارہ کا وجود بھی ختم ہوگیا۔" (ریشمی خطوط سازش کیس میں کون کیا ہے؟ (ص ۴۹)

ایک دوسرے مقام پر مولانا عبید اللہ مرحوم اور جمعیت الانصار کی حکومت مخالف سرگرمیوں کی تفصیلی رپورٹ درج کرنے کے بعد یہی سی، آئی، ڈی لکھتا ہے:

"مدرسہ کی نیک نامی کی بقاکے لیے مجلس منتظمہ نے فیصلہ کیا کہ عبید اللہ کو، انیس احمد اور اس کے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ مدرسہ سے خارج کردینا چاہیے۔ مولانا (شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ) نے یہ فیصلہ پسند نہیں کیا۔"

ان واضح شواہد کے باوجود مہتمم صاحب اس بات پر بضد ہیں کہ مولانا سندھی مرحوم کو نعوذ باللہ ارتدادی عقیدہ کا حامل قرار دے کر دارالعلوم سے ان کے اخراج کے مسئلہ کو تنظیم اور سیاسی سرگرمیوں سے کاٹ دیں جب کہ حضرت شیخ الاسلام ،مولانا گیلانی اور حکومت کا سی، آئی، ڈی سب اس پر متفق ہیں کہ مولانا عبید اللہ سندھی کا دارالعلوم سے اخراج اور جمعیت الانصار کی شکست وریخت محض اس بنیاد پر تھی کہ مولانا سندھی نے ارباب اہتمام کے علی الرغم اس کا رخ انگریز گورنمنٹ کی مخالفت کی جانب موڑدیا تھا اور حقیقتاً حضرت شیخ الہند کے سامنے جمعیت الانصار کے قیام کا مقصد بھی یہی تھا۔

اب بتایا جائے کہ ارباب مدرسہ تنظیم ابنائے قدیم کے کتنے حامی اور

دلدادہ ہیں ؟انھوں نے کب تنظیم قائم کی یا اگر اتفاق سے قائم ہوگی تھی توکب اسے باقی رہنے دیا؟

دور جانے کی ضرورت نہیں اس وقت عالمی موتمر ہی کو دیکھ لیں کہ یہی ارباب اہتمام اس کی مخالفت میں کس طرح ہر قسم کے اوچھے ہتھیاروں سے لیس ہوکر میدان میں اتر پڑے ہیں اور اپنے ہی ابنائے قدیم کو رسوا اور بدنام کرنے کے لیے کیسے کیسے جتن کر رہے ہیں، حتی کہ مسلک ومشرب کو بالائے طاق رکھ کر مودودیوں سے رشتہ ارتباط ہموار کیا جارہا ہے، پھر یہ عجیب معاملہ ہے کہ انھیں ثابت شدہ امور کی جانب اس فقیر نے صرف اشارہ کر دیا تو حضرت مہتمم صاحب اس درجہ برہم ہوگئے کہ ساب الموتی، داستان ساز وغیرہ بناڈالا، لیکن انھیں باتوں کو آج سے تقریباً ۲۸، ۲۹ برس قبل مولانا گیلانی نے نہ صرف یہ کہ زبانی کہا بلکہ اسے لکھ کر ماہنامہ دارالعلوم میں "جو حضرت مہتمم صاحب کی زیر نگرانی شائع ہوتا ہے" چھپوادیا، لیکن مہتمم صاحب نہ مولانا گیلانی کے اوپر خفا ہوئے اور نہ تردیدی مضمون لکھنے کی ضرورت محسوس کی، آخر یہ تفریق کیوں ہے ؟ کیا مولانا گیلانی کی تردید کرنے سے یہ اندیشہ تو نہیں مانع ہو گیا تھا کہ اگر انھیں چھیڑ دیا گیا تو بہت سے سربستہ راز طشت ازبام ہوجائیں گے ؟ آگے چل کر اپنے اسی دعوے کو قوی کرنے کی سعی میں لکھتے ہیں:

"پھر اس تفاوت مشرب کو شدت سے محسوس کیا جانا اور اس مولانا سندھی کے علاحدہ کیے جانے کا عزم درحقیقت حضرت بانی اعظم مولانا محمد قاسم صاحب رحمہ اللہ علیہ کے اس بنیادی اصول پر مبنی تھا، جو ان کے اصول ہشت گانہ میں سے ایک اہم اصول ہے، جو دارالعلوم اور دیگر مدارس دینیہ کے لیے آپ نے وضع فرمائے تھے حضرت اقدس لکھتے ہیں کہ "یہ بات بہت ضروری کہ مدرسین مدرسہ باہم متفق المشرب ہوں اور مثل علماء روزگار خودبین اور دوسروں کے درپے توہین نہ ہوں۔ خدانخواستہ جب اس کی نوبت آئے گی تو پھر اس مدرسہ کی خیر نہیں۔" (داستان کی حقیقت

ص ۷)

کاش آج مودودیوں سے پینگیں بڑھاتے وقت اس اصول کا خیال رکھا جاتا اور مودودیت نواز کارکنوں کو رکھ کر مسلک دارالعلوم کو تاراج نہ کیا جاتا۔ یہ اصول سر آنکھوں پر؟ مگر کیا یہ درست ہے کہ مولانا عبید اللہ مرحوم دیوبندی مسلک و مشرب کے پابند نہیں تھے اور اسی لیے اس اصول کی روشنی میں ان کو علاحدہ کیا گیا؟ بالکل نہیں دارالعلوم سے ان کے اخراج کا سبب ان کی حکومت برطانیہ کی مخالفانہ پالیسی تھی، جسے ہم گذشتہ سطور میں بالتفصیل اور قوی دلائل سے ثابت کر چکے ہیں۔ باقی رہا مولانا سندھی کے مسلک و مشرب کا سوال تو اس کے لیے حضرت شیخ الاسلام مولانا وابو نا سید حسین احمد مدنی قدس سرہ کی تحریر ملاخطہ ہو:

> جن لوگوں نے ان کو (مولانا سندھی) سنہ ۱۳۲۶ھ اور اس کے مابعد زمانہ میں دیکھا ہے وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مولانا موصوف عموماً نہایت ساکت وصامت رہتے تھے۔ فضول گوئی اور لایعنی امور سے نہایت محترز، مشاغل قلبیہ اور معارف علمیہ میں منہمک، عباداتِ اور اعمال صالحہ کے دلدادہ، بزرگان دین اور اکابر امت کے انتہائی مخلص اور ان کے عقیدت مند اور متادب پائے جاتے تھے۔ ان کی ہر ہر حرکت اور سکون اور ہر ہر قول و عمل سے متانت ورزانت ٹپکتی تھی، قرآن شریف کی خدمت اور احادیث نبویہ اور کتب دینیہ فقہیہ وغیرہ کی اشاعت و تعلیم ان کا سرمایۂ حیات تھا، ان پر زرومال، جاہ وعزت کا کوئی اثر نہ تھا، روپیہ کو ٹھیکری بلکہ مینگنی کی طرح سمجھتے تھے اور جاہ دنیاوی اور عزت فی الخلق کو لاشی محض خیال کرتے تھے، امرا اور اہل دولت سے ان کو وابستگی تو در کنار نفرت تامہ تھی، غربا، فقرا، طلبہ اور اہل اللہ سے ان کو انس عظیم تھا، دن رات اصلاح عقائد واعمال میں کوشاں اور مسلمانوں کی ترقی کی فکر اور امت مسلمہ کی مغربی زہر آلود تعلیم اور الحاد وبے دینی کے وبائی جراثیم سے حفاظت مشغلہ اور نصب العین تھا۔"

(ذاتی ڈائری مولانا عبید اللہ سندھی، ص ۴۳)

اس عبارت کو ایک بار پھر پڑھ جائیے فضول گوئی اور لایعنی امور سے احتراز، مشاغل قلبیہ اور معارف علمیہ میں انہماک، عبادات اور اعمال صالحہ کے دلدادہ، بزرگان دین واکابر امت کے مخلص اور معتقد، متانت ورزانت کے پیکر، کتاب اللہ وسنت رسول اللہ کی خدمت سرمایہ حیات، مال وجاہ اور دنیاوی عزت سے بے پروا، امرا اور اہل ثروت سے متنفر، فقرا، طلبہ اور اہل اللہ کے گرویدہ، اصلاح عقائد واعمال صالحہ کی ترقی میں کوشاں وغیرہ خصائل حمیدہ کس شخص کے شمار کرائے جارہے ہیں؟ یہ جملہ اوصاف حسنہ اسی مظلوم حضرت سندھی کے ہیں جسے غیر تو خیر دشمن سمجھتے ہی رہے، اپنوں نے بھی مرتد اور واجب القتل وغیرہ کہہ کر اپنی مجلس سے خارج کردیا:

زاہدِ تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں

آخر ان اوصاف وخصائل کے باوجود وہ کیوں کر دیوبندی مسلک ومشرب سے مختلف تھے، کیا ان صفات حسنہ کے علاوہ دیوبندی مسلک ومشرب کچھ اور ہے؟

پھر حضرت نانوتوی قدس سرہ کا یہ اصول حضرات اساتذہ کے لیے ہے، مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم میں مدرس نہیں تھے، بلکہ وہ ابنائے قدیم کی تنظیم کے ناظم تھے، جسے بدقسمتی سے اہتمام نے اپنے اختیارات کے حصار میں محصور کر رکھا تھا، اس لیے وہ اس اصول کے ذیل میں آتے ہی نہیں۔ لیکن اپنی مقصد براری کے لیے کھینچ تان کر اس اصول کو ان پر چسپاں کیا جارہا ہے۔ آگے بطور پیش بندی اور دفع دخل مقدر کے ارشاد ہوتا ہے:

"رہا یہ کہ حضرت مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے اس اختلافی فکر ونظر کے باوجود مولانا سندھی کو اپنے سے کیوں وابستہ رکھا اور ان

کے اختلاف مشرب کو برداشت کیا، سووہ معاذ اللہ ارباب اہتمام کے علی الرغم یا ان کے مقابلہ کے لیے نہ تھا جیسا کہ مشہور کیا جارہا ہے، بلکہ اس لیے تھا کہ حضرت شیخ الہند جو کام ان سے لینا چاہتے تھے اس کے انجام دینے کی صلاحیت انھیں میں سب سے زیادہ محسوس فرماتے تھے۔" (داستان کی حقیقت، ص۸)

اسی لیے تو موصوف کو برداشت نہیں کیا گیا، اگر عقیدے اور دین کی بات ہوتی تو اس مباحثہ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کو جو کہ شیخ الحدیث، استاذ الکل اور حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے جانشین اور ان کی امانتوں کے صحیح امین تھے، ضرور شریک کیا گیا ہوتا۔ ان کا ایک اشارہ مولانا سندھی کے رجوع کے لیے کافی ہوتا، مگر یہ علمی بحث ومباحثہ تو محض دکھانے کے لیے تھا اصل سازش تو انگریز کی تھی۔

کیا اچھا ہوتا کہ حضرت مہتمم صاحب نے لگے ہاتھوں اس مسئلہ کو بھی صاف کر دیا ہوتا تاکہ حضرت شیخ الہند قدس سرہ مولانا سندھی کے ساتھ نصرت وحمایت اور مودت ومحبت کا جو معاملہ فرماتے تھے کیا کسی فاسد العقیدہ، واجب القتل مرتد کے ساتھ ایک دینی مقتدا کا اس طرح کا برتاؤ شرعاً روا اور جائز ہے؟

کافر ومشرک اور مرتد کے احکام میں زمین وآسمان کا فرق ہے۔ اس لیے تحریکات میں غیر مسلموں کی شمولیت کو نظیر بنانا عبث ہے حیرت ہے کہ مہتمم صاحب باایں تبحر علمی ایک واضح حقیقت کو چھپانے کی تگ ودو میں کیسی کیسی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

سچی بات تو یہی ہے کہ مولانا سندھی کے ساتھ ارباب اہتمام نے جو کچھ کیا وہ اسی جرم بے گناہی کی سزا کے طور پر تھا جس کا چسکا ان کے اندر خود حضرت شیخ الہند رہ نے پیدا کیا تھا یعنی انگریز دشمنی جسے ارباب اہتمام ایک لمحہ کے لیے بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھے، لیکن براہ راست اس پر ایکشن

لینے میں بہت سے خطرات تھے اور سب سے بڑا خطرہ تو خود حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی تھی۔ اس لیے ایک علمی مسئلہ کا شاخسانہ بظاہر کھڑا کر کے اس کی آڑ میں مظلوم حضرت سندھی کو ہٹایا گیا۔ اس کارروائی سے حضرت شیخ الہند رح کو کس قدر اذیت پہنچی تھی اور اس سے وہ کس درجہ متاثر ہوئے تھے' اس کا کچھ اندازہ اس واقعہ سے ہوسکتا ہے کہ اس کارروائی کے عمل میں آنے کے بعد جب حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جن سے مولانا سندھی کی تکفیر کے فتوی پر دستخط لیا گیا تھا حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی مجلس میں پہنچے تو حضرت نے ان کی جانب سے رخ پھیر لیا بعد میں بڑی منت وسماجت کے بعد ان سے راضی ہوئے' اگر یہ کارروائی واقعی شرعی نقطہ نظر کے مطابق تھی اور دین کے ایک اہم تقاضے کو پورا کرنے کے لیے عمل میں لائی گی تھی تو اس سے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی ناراضگی وناگواری کی کیا توجیہہ ہوگی؟ پھر یہی مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ جو بقول حضرت مہتمم صاحب اس مسئلہ میں پیش پیش تھے اور مولانا سندھی سے اکثر مباحثہ کرتے تھے' انھیں کو بعد میں اپنی غلطی کا احساس ہوتا ہے تو مولانا سندھی کے نام حجاز سے' ایک پیغام بھیج کر معذرت چاہتے ہیں۔ ملاحظہ ہو شاہ صاحب رحمت اللہ علیہ کا معذرت نامہ:

> "قیام دیوبند کے زمانہ میں غلط فہمی کی وجہ سے میں آپ کے لیے تکلیف کا باعث بنا تھا' اب میرے دل میں آپ کے لیے کوئی رنج نہیں امید ہے کہ آپ بھی معاف فرمائیں گے۔"

(نقش حیات' ص ۱۴۴' جلد ۲)

اگر یہ شرعی مسئلہ تھا تو غلط فہمی سے اسے کیوں تعبیر کیا جارہا ہے اور اس پر معذرت ومعافی کے کیا معنی ہیں؟ بلکہ غلط فہمی کے الفاظ نے اصل حقیقت سے پردہ اٹھا دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ارباب اہتمام اور حضرت شیخ الہند و مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ کی راہیں الگ الگ تھیں۔ اول الذکر حلقہ چاہتا تھا کہ حضرت نانوتوی کے مشن کے بر خلاف دارالعلوم کے اساتذہ اور کارکنان قومی سیاست سے الگ

تھلگ رہ کر صرف تعلیم و تعلّم اور درس و تدریس کی حد تک اپنی دلچسپیوں کو مرکوز رکھیں تاکہ انگریز کے عتاب سے بچے رہیں اور اس کے تقرب اور عنایات کے سزاوار ٹھہریں، جب کہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے ساختہ و پرداختہ مولانا سندھی قومی سیاست سے عدم دلچسپی کو دارالعلوم کے مقاصد اور نصب العین سے انحراف سمجھتے تھے۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ ناقل ہیں:

"ایک دن ایسا ہوا کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے فقیر کو یاد فرمایا اور کہا کہ تم حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے مل کر دریافت کرو کہ واقعی سیاست میں حضرت والا کا صحیح مسلک کیا ہے؟ شاید ظہر کی نماز کے بعد کا واقعہ ہے۔ مسجد کے احاطہ میں ایک کمرہ تھا جسے اس زمانہ میں دارالتصنیف کا نام دیا گیا تھا اس کمرہ میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اپنی زندگی کے آخری مشغلہ یعنی ترجمہ قرآن مجید کا کام کچھ دیر کیا کرتے تھے۔ فقیر تو اسی احاطہ کا باشندہ تھا، نماز کے بعد حضرت اسی تصنیف و ترجمہ کے کمرہ میں تشریف لے گئے، تنہا تھے، موقع پا کر فقیر بھی پیچھے سے حاضر ہو کر عرض رسا ہوا کہ کچھ عرض کرنا ہے! جیسا کہ قاعدہ تھا خندہ جبینی سے فرمایا گیا کہ آؤ کیا کہنا چاہتے ہو؟ بیٹھ گیا اور جو پیغام میرے سپرد کیا گیا تھا اسے پہنچا دیا گیا، سنتے رہے، اپنی بات جب ختم کر چکا تو دیکھا کہ حضرت پر ایک خاص حال طاری ہے اور اپنے استاذ حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ بانی دارالعلوم جن کو وہ حضرت الاستاذ کے لقب سے یاد کرتے تھے، ان ہی کا نام لے کر فرمایا کہ

"حضرت الاستاذ نے اس مدرسہ کو کیا درس و تدریس، تعلیم و تعلّم کے لیے قائم کیا تھا؟ مدرسہ میرے سامنے قائم ہوا، جہاں تک میں جانتا ہوں سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی ناکامی کے بعد یہ ارادہ کیا گیا کہ کوئی ایسا مرکز قائم کیا جائے، جس کے زیر اثر لوگوں کو تیار کیا جائے تاکہ سنہ ۱۸۵۷ء کی ناکامی کی تلافی کی جائے۔"

آخر میں ارشاد ہوا:

"تعلیم و تعلّم جن کا مقصد اور نصب العین ہے، میں ان کی راہ میں مزاحم نہیں ہوں، لیکن خود اپنے لیے تو اسی راہ کا میں نے انتخاب کیا ہے جس کے لیے دارالعلوم کا نظام میرے نزدیک حضرت الاستاذ نے قائم کیا تھا۔" (ماہنامہ دارالعلوم، جمادی الثانی سنہ ۷۲ ۱۳ھ، ص ۴۲)

اس کے علاوہ دارالعلوم کے حلقہ میں حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا یہ جملہ زبان زدعام ہے کہ فقیر نے اپنے مشن پر علم کا نقاب ڈال دیا ہے"۔

یہ تھا فکر و نظر کا وہ اختلاف جس کے شکار مظلوم مولانا سندھی رحمۃ اللہ علیہ ہوئے۔ اب جس کے جی میں جو آئے کہے، لیکن تاریخ نے جن حقائق کو اپنے سفینوں میں محفوظ کر لیا ہے، اسے مٹا دینا ممکن نہیں۔ اور نہ محرم سنہ ۱۳۶۲ھ (مطابق فروری سنہ ۱۹۴۳ء) کے لکھے ہوئے مولانا گیلانی کے مکتوب کو سنہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۱۹۱۳ء کے واقعہ سے (جمعیت الانصار سے مولانا سندھی کے اخراج سے (جوڑکر) حقیقت پر پردہ ڈالا جا سکتا ہے، کیوں کہ مولانا گیلانی ہی نے (جن کا سہارا لے کر مرحوم و مظلوم سندھی کو نعوذ باللہ واجب القتل و مرتد گردانا جا رہا ہے) پوری صورت حال کو واشگاف کر دیا ہے۔ مظلوم سندھی کو معاذاللہ فاسد العقیدہ، واجب القتل وغیرہ ثابت کرنے کی سعی غیر مشکور کے بعد لکھا جا رہا ہے کہ:

"دوسرا طعن یہ کیا گیا ہے کہ ارباب اہتمام نے قومی خود اختیاری یا ہندوستان کی آزادی میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا، گویا وہ برطانوی حکومت کے پرستار یا اس کے وظیفہ خوار تھے، پہلے طعن سے بھی زیادہ لچر اور پوچ ہے۔"

(داستان کی حقیقت، ص ۱۱)

میری جس تقریر پر یہ ساری خامہ فرسائیاں کی گئی ہیں اور جس کی آڑ لے کر اس فقیر کو طرح طرح کے خطابات والقاب سے نوازا گیا ہے اس تقریر کا ریکارڈ ممکن ہے اب بھی دیوبند میں بعض لوگوں کے پاس محفوظ ہو، اسے

سنا جاسکتا ہے، اس میں کہیں بھی یہ جملے نہیں ملیں گے جنھیں میری جانب منسوب کرکے یہ کرم فرمائیاں کی گئی ہیں۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

لیکن جب خود سے قصہ پارینہ کو چھیڑ دیا گیا ہے تو صحیح واقعات سامنے لانے کے لیے بہر حال کچھ لکھنا ہی پڑے گا۔ دعوی کیا جارہا ہے کہ

"نفس الامری واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے (ارباب اہتمام نے) صرف جنگ آزادی میں حصہ ہی نہیں لیا بلکہ دوسروں کو بھی حصہ دار بنایا۔"

(داستان کی حقیقت ص ۱۱)

یہ دعوی کہاں تک واقعہ کے مطابق ہے، اس کو جانچنے کے لیے دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کے مقابلے میں یہ جنگ لڑی جارہی تھی یعنی حکومت برطانیہ کا خود تاثر ارباب اہتمام کے متعلق کیا تھا اور ان کے ساتھ کیا معاملہ اور برتاؤ کرتی تھی؟ بس اسی چیز کو سامنے رکھ لیجیے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوکر اپنی اصلی ہیئت وحقیقت کے ساتھ ابھر کر سامنے آجائے گا۔ ملاحظہ ہو ریشمی خطوط سازش کیس کا تعارفی حصہ (ڈائریکٹری) جس میں حکومت برطانیہ کی سی آئی ڈی حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ مہتمم دارالعلوم کا تعارفی نوٹ یوں لکھتی ہے:

"محمد احمد صاحب شمس العلماء پسر محمد قاسم بانی مدرسہ دیوبند، یہ مدرسہ کے مہتمم یا پرنسپل ہیں اور (حکومت کے) وفادار ہیں۔"

(کون کیا ہے؟ ص ۶۲)

ایک دوسرے مقام پر یوں تعارف کرایا ہے:

"مدرسہ کے پرنسپل شمس العلماء مولوی حافظ محمد احمد جو

اس ادارہ کے مرحوم بانی کے فرزند ہیں، وفادار اور شریف آدمی ہیں۔" (کون کیا ہے؟، ص ۵۳)

ملاحظہ ہو ایک اور دلیل حکومت وقت کی عظیم نوازش کی، ارباب اہتمام کے معتمد مولانا مناظر احسن گیلانی مرحوم رقم طراز ہیں:

"اللہ اللہ وہ کتنی کڑی اور سخت گھڑی تھی جب حکومت قائمہ (برطانیہ) کی طرف سے حضرت مفتی محمد احمد صاحب رحمت اللہ علیہ کے نام یہ فرمان، مدرسہ آیا کہ نہری علاقہ میں زمین کا ایک بڑا سرسبز وشاداب رقبہ آپ کی خدمت میں حکومت پیش کرتی ہے۔ شاید سیکڑوں ہی ایکڑ یا بیگھے پر حکومت کا یہ موہو بہ رقبہ مشتمل تھا مشورے کی اس مجلس میں جس میں حکومت کا یہ فرمان غور وخوض کے لیے پیش ہوا، اس فقیر کو بھی بلا کر شریک کر لیا گیا تھا، قبول کیا جائے یا نہ قبول کیا جائے؟ اس پر دیر تک بحث ہوتی رہی۔ آخر میں طے یہی ہوا کہ قبول کرنے کی صورت میں مدرسہ کے اہتمام کا رشتہ حافظ مرحوم کو منقطع کر دینا پڑے گا۔ الخ"

(ماہنامہ دارالعلوم، شوال سنہ ۱۳۷۲ھ)

چوں کہ اس عطیۂ برطانوی کو قبول کر لینے کی صورت میں دارالعلوم کا اقتدار و اہتمام جا رہا تھا جیسا کہ شریک مجلس مولانا گیلانی مرحوم اطلاع دے رہے ہیں۔ اس لیے ایک وفد صورت حال کی نزاکت سے حکومت کو آگاہ کرنے کے لیے روانہ ہوا، چناں چہ حکومت وقت نے ایک ایسی خوبصورت راہ نکال دی کہ عطیۂ شاہی سے فیضیابی بھی ہوتی رہے اور دارالعلوم کے اہتمام پر بھی آنچ نہ آئے، یعنی حکومت کے اشارے پر نظام حیدر آباد نے مفتی اعظم کے منصب کو تفویض کر کے اچھی خاصی رقم بنام وظیفہ جاری کر دی، جو آج کل کے بیسیوں ہزار پر بھاری تھی، اور گھر کے ہر ہر فرد کو پچاس پچاس روپے کا عطیہ مزید براں، یہ سلسلہ سنہ ۱۳۴۱ء سے سنہ... تک جاری رہا۔

مولانا حبیب الرحمن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نائب مہتمم دارالعلوم کے متعلق بھی

حکومت کا تاثر وہی تھا جو مہتمم صاحب کے بارے میں تھا۔ سی، آئی، ڈی اپنی رپورٹ میں لکھتی ہے :

"حبیب الرحمن، مولوی نائب مہتمم دیوبند مدرسہ ..... مولانا عبید اللہ اور مولانا محمود حسن کی اسکیموں میں شامل نہیں تھے، ان کو وفادار سمجھا جاسکتا ہے۔" (کون کیا ہے ؟ ص ۴۱)

ان سارے دلائل وشواہد سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوگئی کہ ایک طرف تو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقا ہر طرح کے خطرات کو مول لے کر حکومت برطانیہ سے حق خود اختیاری اور آزادی ملک کی جنگ لڑ رہے تھے، دوسری جانب ارباب اہتمام حکومت سے وفاداری جتانے کے لیے گورنر کو دعوتیں دے کر ان کی مدح اور ستائش میں قصیدے اور ایڈریس پیش کر رہے تھے اور اس کے صلہ میں عطیات وخطابات سے نوازے جارہے تھے، اور اس پر دعویٰ یہ ہے کہ

"انھوں نے (ارباب اہتمام نے) صرف جنگ آزادی میں حصہ ہی نہیں لیا بلکہ دوسروں کو بھی حصہ دار بنایا۔"

آخر ان تاریخی شواہد کے ہوتے ہوئے کون اس نرے دعوی کو باور کرسکتا ہے۔

اے کاش کہ حضرت مہتمم صاحب تاریخ کے اس دبے ہوئے زخم کو نہ کریدتے، خدا شاہد ہے کہ جو کچھ بھی لکھا گیا ہے، دل پر پتھر رکھ کر لکھا گیا اور انتہائی مجبور کر دیے جانے پر، ورنہ اپریل ۱۹۸۰ء ہی سے دفتر اہتمام اور دفتر رابطہ میرے خلاف جو مہم درپردہ چلا رہے ہیں میں نے ان کی جانب کوئی خاص توجہ نہ دی ہلیکن اب ذمہ دارانہ طور پر خود حضرت مہتمم صاحب بھی اس کار خیر میں بنفس نفیس شریک ہوگئے ہیں تو اب خاموشی اقبال جرم سمجھی جائے گی۔ اس لیے صحیح صورت حال کو سامنے لانے کے لیے نہ چاہتے ہوئے بھی بدرجہ مجبوری یہ ناخوشگوار فریضہ انجام دینا پڑا

لگے گی چوٹ بربط پر تو نالے پھوٹ نکلیں گے
اگر یہ بھی گراں گزرے تو کوئی زخمہ زن کیوں ہو

(مولانا سید) اسعد مدنی غفرلہ
صدر عالمی موتمر و جمعیت علمائے ہند
صفر سنہ ۱۴۰۱ھ

ضمیمہ سوم:

تشریح واقعہ دیوبند

عطائے اعزاز کی حقیقت

حکومت یوپی کے سیکریٹری کے مراسلہ بنام سیکریٹری حکومت ہند مورخہ ۲۸ ت اکتوبر ۱۹۱۵ء میں جو شیخ الہند مولانا محمود حسن رہ کے بارے میں ہے، 'مولانا محمد احمد مرحوم کے اس سپاس نامے کا ذکر ہے جو ان کی جانب سے انھی کی سربراہی میں ایک پانچ رکنی وفد نے انھیں شمس العلماء کا خطاب ملنے کی خوشی میں اظہار تشکر کے طور پر پیش کیا تھا۔ اس کے دوسرے پیراگراف میں کہا گیا ہے:

"سپاس نامے کے ساتھ اس (سپاس نامہ پڑھنے والے) مولوی نے ہزآنر کی خدمت میں ایک پمفلٹ بھی پیش کیا، جس میں اخبار زمیندار (لاہور) سے کچھ اقتباسات درج تھے۔ اس پمفلٹ میں مولوی محمد احمد مہتمم دارالعلوم) کو حکومت کی طرف سے دیے گئے شمس العلماء" کے دنیاوی اعزاز کو قبول کرنے پر انھیں "زر کا بندہ" کہہ کر گالی دی گئی تھی۔ اس کا جو جواب دیوبند کے مولوی شبیر احمد عثمانی کی طرف سے دیا گیا تھا، وہ بھی ہزآنر کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ان سب کا خیال ہے کہ وہ پمفلٹ الہلال (کلکتہ) کے ایڈیٹر مولوی ابوالکلام آزاد کا لکھا ہوا ہے چوں کہ ان کی طرف سے کوئی جواب الجواب نہیں آیا، اس لیے یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے اس کا جواب نہیں بن پڑا۔"

اس پیراگراف میں زمیندار کے جس مضمون اور اس پر مبنی جس پمفلٹ کا ذکر آیا ہے وہ مضمون یا پمفلٹ تو دستیاب نہیں لیکن مولانا شبیر احمد عثمانی نے جو جوابی مضمون لکھا تھا، وہ موجود ہے۔ یہ مضمون القاسم دیوبند بابت ۱۰ ار رمضان ۱۳۳۳ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۱۵ء میں چھپا تھا (صفحہ ۱ تا ۱۷) اس سے زمیندار کے مبینہ مضمون کے مطالب کا اندازہ ہو جاتا ہے نیز اس سے معلوم ہوتا ہے:

ا۔ مبینہ مضمون (ہمدرد، دہلی) کے ایک لیڈنگ آرٹیکل کو بنیاد کر لکھا گیا تھا اور زمیندار کی اشاعت ۳ار جولائی ۱۹۱۵ء میں چھپا تھا

۲۔ یہ مضمون حقیقت نگار کے قلمی نام سے چھپا تھا اراکین کے خیال میں یہ مولانا ابوالکلام آزاد کا لکھا ہوا ہے۔ یہ بات درست بھی ہو سکتی ہے، لیکن یہ محض قیاس ہے۔

۳۔ اراکین وفد کے قیاس میں مولانا شبیر احمد عثمانی کا مضمون اس کا مسکت جواب ہے۔ ابوالکلام آزاد سے اس کا جواب بن نہیں پڑا لیکن یہ محض زعم ہے مجھے تو اس مضمون میں کوئی جان نظر نہیں آتی۔ مولانا محمد احمد کے دفاع میں زور قلم صرف کر دیا ہے لیکن اعتراض کا بنیادی نکتہ کہ یہ اعزاز انھیں سرکار کی خفیہ خدمات کے صلے میں دیا گیا ہے' اپنی جگہ پر ہے اس کے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں۔

۴۔ مضمون کا یہ پہلو نہایت کمزور ہے کہ مولانا محمد احمد صاحب نے کوئی ایسا عمل انجام نہیں دیا جو اس سے پہلے انجام نہ دیا جا چکا ہو۔ اس کی کچھ مثالیں بھی پیش کر دی گئی ہیں۔

۵۔ حضرت مولانا قاسم نانوتوی کے زمانے سے لے کر حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی کے زمانے (۱۹۰۵ء) تک کے حالات کی سنگینی اور ۱۹۱۵ء کے حالات کے فرق کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ کہاں ۱۹۰۵ء تک حالات کا جبر اور کہاں ۱۹۰۶ء کے بعد کے حالات، جب تحریک آزادی ایک نئے دور میں داخل ہوگئی تھی اور تحریک قاسمی اپنے ابتدائی دور سے نکل چکی تھی۔ اب نظروں سے چھپا کر اس کی پرورش اور نشو ونما کی ضرورت نہ تھی، بلکہ وقت آگیا تھا کہ اسے زمانے سے نظریں چار کرنا سکھایا جائے لیکن قاسمی وعثمانی خاندان کے صاجزادگان حریت پرستی کی آگ کی اس گرمی کو محسوس ہی نہ کر رہے تھے جو حضرت قاسم العلوم والخیرات کے شاگرد رشید مولانا محمود حسن کے سینے میں بھڑک رہی تھی اور جس نے ان کے خاص شاگردوں اور دہلی وکلکتہ کے بعض اکابر کے سینوں کو بھی گرما دیا تھا۔

افسوس! یہ صاجزدگان ۱۹۱۵ء میں بھی برٹش استعمار کے لیے مخبری کرنے اور خفیہ اعمال بجالانے میں مصروف تھے۔ حتی کہ وہ حضرت قاسم العلوم کے شاگرد رشید، جانشین علم وفکر اور انقلابی تحریک کے ایثار پیشہ کارکنوں کو اس کے مرکز فکر وانقلاب سے دور کرنے اور انھیں دشمنوں کے حوالے کر دینے کے درپے تھے۔

۶۔ برٹش استعمار کے نمایندوں اور مسلمان امرا اور والیئہ بھوپال کی خدمت میں سپاس ناموں کا موازنہ تو بالکل ہی غلط ہے

۷۔ کسی دفاعی تحریر میں تنقید نگار یا مضمون نویس کو کس معروف داستان طراز اور دروغ گو مورخ سے تشبیہ دینا یا اس کی طرف کوئی اشارہ کرنا اعتراض کا ہرگز معقول انداز جواب نہیں ہوتا۔ یہ اسلوب تحریر علمی متانت کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔

۸۔ زمیندار (لاہور) کے حقیقت نگار کا اشارہ اس طرف تھا کہ مولانا محمد احمد صاحب کو خطاب ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں نہیں بلکہ سرکاری خدمات کی انجام دہی کے صلے میں دیا گیا تھا۔ یہ بات اس وقت تو صرف ان کے اعمال دیکھنے والوں اور خاص جاننے والوں کے علم میں تھی۔ یہ خدمات جو انھوں نے جمعیت الانصار کی انقلابی تحریک کو ختم کرنے میں برٹش استعمار کے لیے انجام دے تھے اور خفیہ کارروائیوں کی تفصیلات سی، آئی، ڈی کے فائلوں میں چھپی ہوئی تھیں، لیکن اب کہ یہ تمام راز فاش ہو چکے ہیں، بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ شمس العلماء کا خطاب ان کی انھیں خدمات کا صلہ تھا۔ اور جب مولانا محمد احمد رہ کے بعد ۱۹۲۵ء میں مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رہ کو حیدر آباد دکن میں منصب افتاء پر فائز کیا گیا تھا تو یہ ان کی خدمات کا صلہ تھا جو انھوں نے حضرت مہتمم صاحب رہ کے ساتھ انجام دی تھیں۔

اس داستان الم کو کہاں تک دراز کیا جائے اور اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اس کے اندازے کے لیے یہ کتاب، اس میں شامل سرکاری رپورٹیں، ضمیمہ جات، تحریک شیخ الہند اور اس کی دستاویزات (مرتبہ مولانا سید محمد میاں رہ) دی انڈین مسلمز ۔۔۔ اے ڈاکومنٹری ریکارڈ (شان محمد) تحریک ریشمی رومال اور سندھ (ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری) وغیرہ، ان صاحبزادگان کی بے بصیرتی بلکہ اس سے بہت زیادہ پر شاہد عدل ہیں۔

اب آپ مولانا شبیر احمد عثمانی رہ کا مضمون ملاحظہ فرمائیے۔ (ا۔ س۔ ش)

اس تحریر میں ہمارا روے سخن اس مستور الاسم حقیقت نگار کی طرف ہے جس نے اپنے قلبی بخارات کے ہیجان یا آج کل کی عام اور نمایشی پولیٹکل حریت کے غرور سے مغلوب ہوکر اخبار زمیندار کے اوراق میں زیر عنوان بالا ہمدرد کے ایک افتتاحیہ (لیڈنگ آرٹیکل) کی تردید کا عقلی اور اخلاقی فرض ادا کیا ہے۔

اور گو بظاہر خاص ہم سے اس میں خطاب نہ ہو لیکن چوں کہ "حقیقت نگار" کی فرایض عقلی واخلاقی میں " ہر واقعہ کا اس کی حقیقت اور اصلیت کے ساتھ قبول کرنا" اور ہمارے فرایض مذہبی میں (بقاعدہ النصح لکل مسلم) کسی واقعہ کی صحیح صحیح اصلیت کو واضح کرکے اس طرح کے طالبان حقیقت کو (جن کا وجود بدقسمتی سے آج کل بہت ہی شاذ ہے) ان کے پاک مقصد میں امداد دینا ہے۔

اس لیے فی الحال ان چند سطروں کے لکھنے کی ہم نے ضرورت سمجھی جس میں اگر پھر مناسب معلوم ہوا تو اور بھی اضافہ کیا جاسکے گا۔

باوجود کہ زمیندار کا یہ پرچہ ہم کو بہت تلاش کی بعد پرسوں دستیاب ہوسکا مگر تاہم غنیمت سمجھنا چاہیے کہ ۱۲۔ جون کے ہمدرد کی تصحیح جبکہ ۱۳۔ جولائی کے زمیندار میں پورے ایک مہینہ کے بعد شائع ہوئی تو ہم آج اس سے تقریبا نصف عرصہ میں زمیندار کے مضمون پر ایک راست بازانہ تنقید لکھ کر پریس کو

روانہ کر رہے ہیں۔

اگرچہ ضرورتیں اور مجبوریاں بہت سے مخظورات کو مباح بنا دیتی ہیں، جن میں سے ہی ایک یہ مضمون ہے جو میں چھپنے کے واسطے بھیج رہا ہوں لیکن فی الوقت ہم کو سخت افسوس ہے کہ ہمیں اپنے بہت سے مشاغل عزیز ترک کر کے ایک ایسی بے مزا، ناگوار اور غیر سود مند بحث میں آنا پڑا جو اس عام اتفاق کی لہر اور اخوۃ اسلامیہ کی رسی کو مضبوط کرنے کے زمانہ میں نہایت ہی نامبارک ہے۔ مگر جس میں دخل دینے پر ہم کو حقیقت نگار کی پر زور جنبش قلم نے مجبور کر دیا ہے۔

حالاں کہ اس قسم کے سوال وجواب میں ہمیشہ دنبالہ کلام کا دراز ہونا قدرتی ہے (چناں چہ ہمدرد کی ۱۵، ۲۰ سطروں کے مقابلہ میں زمیندار کو اپنے چار سے زیادہ ایڈیٹوریل کالم نذر کرنے پڑے) اس پر بھی میں اپنی اس تحریر میں اس خیال سے کہ "جماعت اسلام کے درمیان ایسے تلخ کام معلومات کی تکرار جس قدر بھی کم ہو اچھا ہے" ایجاز واختصار کے پہلو کو ہاتھ سے دینا پسند نہیں کروں گا۔

سب سے پہلے مناسب ہے کہ ہم ہمدرد کی تحریر کا خلاصہ خود حقیقت نگار کے الفاظ میں بیان کر دیں، جو یہ ہیں:

۱۔ "جس طرح سرآمد خدام ہند شیخ الاحرار قبلہ فدا کاران و سرفروشان عصر مسٹر گاندھی کو باایں ہمہ ملت پرستی وحریت کاری خطاب کا ملنا تعجب انگیز ہے۔ ایسا ہی یہ واقعہ بھی تعجب انگیز ہے کہ مولانا محمد احمد صاحب (مہتمم دارالعلوم، دیوبند) کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔

۲۔ عام طور پر آج تک جو طرز عمل عطائے خطابات ومناصب میں رہا ہے (یعنی بالعموم ان لوگوں کو خطاب دینا جو مقاصد عالیہ کے لیے سرا پا عملاً خدمات انجام دے چکے ہوں یا ان سے اس طرح کی خدمات متوقع ہوں) اس کے لحاظ سے مولانا موصوف کو شمس العلما بنانا تعجب انگیز یا اقلاً خلاف توقع ہے۔

۳۔ اس لیے کہ مولانا کی آزاد شخصیت اور بے باکانہ صداقت جلسہ سہارن پور میں ظاہر ہو چکی ہے۔

۴۔ مولانا کی اعلیٰ شخصیت کو نہ کبھی پہلے خطاب کی ضرورت تھی اور نہ (خدانخواستہ) کبھی ہو۔

بآب ورنگ وخال وخط چہ حاجت روے زیبارا

امور مذکورہ بالا میں سے امر اول پر نظر ڈالتے ہوئے حقیقت نگار موصوف کا پیمانہ جوش چھلک پڑا اور انھوں نے سخت نعل در آتش ہوکر ایڈیٹر ہمدرد سے یہ مواخذہ کیا ہے کہ "مشہور وطن پرست مسٹر گاندھی اور مدرسہ دیوبند کے تنخواہ دار مہتمم مولانا احمد صاحب دونوں کو ایک صف میں کھڑا کرنے کا آپ کو کیا استحقاق تھا۔ جب کہ موخر الذکر کو کسی قسم کے ایثار قومی اور فداکاری کے دکھلانے کا موقعہ نہیں ملا۔ اور برخلاف اس کے مسٹر گاندھی نے جو کچھ کیا وہ تاریخ صداقت ووطن پرستی میں محفوظ ہے۔" بلاشبہ حقیقت نگار موصوف کی طرح ہمارے لیے بھی اس امر کا احساس سخت تکلیف دہ ہے کہ ایک شیر بیشہ مذہب اور ایک آزار پولیٹکل پہلوان کو ایک دنگل میں اتار دیا جائے یا کسی سادہ اور روشن ضمیر خدا پرست کو کسی معروف و مصطلح وطن پرست کی صف سیاست میں لاکر کھڑا کر دیا جائے کیوں کہ

صلاح کار کجا ومن خراب کجا
بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا
چہ نسبت است برندی صلاح وتقویٰ را
سماع وعظ کجا نغمہ رباب کجا

لیکن ہم جانتے ہیں کہ فی الحقیقت معزز ایڈیٹر ہمدرد پر کسی ایسی صف آرائی کا الزام رکھنا محض بے بنیاد ہے جس میں مسٹر گاندھی اور مولانا کو دوش بدوش کھڑا کیا گیا ہو۔

ہمدرد کے ان الفاظ سے کہ " دیوبند کے ایک سیدھے سادے نے غیر شہرت پسند بزرگ (مہتمم دار العلوم الاسلامیہ) کو بے مانگے شمس العلماء کا خطاب ملنا ایسا ہی خلاف توقع اور غیر مترقب ہے جیسا کہ مسٹر گاندھی کی جنوبی افریقہ کی خدمات کا صلہ ہندوستان میں بصورت خطاب دیا جانا" میں نہیں سمجھتا کہ کس منطق کی بنا پر دونوں کے کارناموں کی مساوات اور ان کے پوزیشنوں کے عدم امتیاز کا نتیجہ نکال لیا گیا۔ ہمدرد خود دونوں کے خدمات کی طرف اشارہ کر کے ہر ایک کی نوعیت کو اپنے مختصر جملوں میں واضح کر رہا ہے لیکن آپ ہیں کہ نہیں دیکھتے اور نہیں سنتے!

آپ کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ دار العلوم دیوبند، جس کے اہتمام کی ذمہ داری مولانا احمد صاحب کو لوگوں میں ممتاز بناتی ہے، کوئی معمولی مکتب یا انجمن نہیں ہے۔ وہ ہندوستان کے مسلمانوں کی سب سے بڑی مذہبی یادگار ہے جس کے بانی، جس کے فیضیاب طلبہ، جس کے مدرسین، جس کا نصاب تعلیم اور جس کا سارا اسٹاف خالص مذہب کی روح اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس نے ہمیشہ اپنی خاموش، پر امن بے ضرر مگر پائدار ناممکن التبدیل اور نہایت ہی غیر متزلزل رفتار میں مذہب کی تعلیم کو عام کیا اور سچے اسلامی جذبات کو عوام وخواص اور مشرق ومغرب تک پہنچایا۔

وہ اپنی آواز پر کان دھرنے والوں کو اس وقت بھی جب کہ "ہندوستان میں مسلمانوں کے بڑے بھاری لیڈر کانگریس کے مقاصد میں شرکت کرنے کو حماقت اور گمراہی سمجھتے تھے" اور جب کہ "قرآن کریم میں سے بہت ساری گرم جوش آیات کو لفظاً یا معناً نکال ڈالنے کا مسودہ پیش ہو رہا تھا۔" اسی قرآن اور اسی دفتر احادیث کے تمام ابواب کی بے کم وکاست اور آزادانہ تعلیم دے رہا تھا، جس کی آج اس زمانہ میں دے رہا ہے جب کہ مسلم لیگ اور کانگریس کو مدغم کیے جانے کی کوشش ہے۔ اور جب کہ پرجوش جذبات کی نمایش کرنے والے ان ہی مولویوں کو جن کو وہ دس بیس سال پہلے مذہبی مجنون، دیوانہ، ناعاقبت

اندیش کہا کرتے تھے اب نہایت کمزور، بزدل اور مصلحت ساز خوشامدی بتلاتے ہیں۔

انقلاب لیل ونہار کو دیکھو اور بغور دیکھو کہ ایک وہ حالت تھی جب کہ دارالعلوم کو مغویانہ اور برہم زن امن وامان اور مفسد ملک وملت سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک مطبوعہ اشتہار میں "قابل غور گورنمنٹ" کے عنوان سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ "سرحد کابل اور دوسری جگہ کے مسلمان جہاں کہیں نصاریٰ سے جنگ کرتے ہیں ان سب کی اسٹیم دیوبند کا مدرسہ تیار کر رہا ہے۔"

اور آج ایک یہ کیفیت ہے کہ ان ہی اسٹیم تیار کرنے والوں کو (در آں حالے کہ ہم ثابت کریں گے کہ وہ ابھی تک اپنے اکابر سلف کے قدم بقدم چل رہے ہیں) خوشامدی اور دین فروش یا اس کا مرادف قرار دیا جا رہا ہے۔

لیکن آپ خوب یاد رکھیں کہ جس طرح دارالعلوم کے ارکان کے قدم بحمد اللہ مقدم الذکر حملوں سے نہیں ڈگمگائے اسی طرح ان دوسری قسم کے جھٹکوں سے بھی کوئی وجہ نہیں کہ وہ لڑکھڑا کر گر پڑیں:

عنقا شکار کس نشود دام باز چین
کانجا ہمیشہ باد بدستست دام را

جو لوگ دارالعلوم کی اندرونی تاریخ سے ذرا گہری واقفیت رکھتے ہیں، ان کو یہ بخوبی معلوم ہے کہ پچھلے زمانہ میں مختلف مذاق کے لوگوں نے کس کس طرح دارالعلوم کو قوم میں بدنام کرنے یا اس کی جانب سے گورنمنٹ کو بدگمان بنانے کی ہلاکت انگیز کوششوں کا جال پھیلایا، اور باوجود اس کے مولانا محمد احمد صاحب کی زبردست شخصیت نے دارالعلوم کی پرانی پالیسی کو تھامے رکھنے میں (جو ایک ذمہ دار اور بہادر مہتمم کا سب سے بڑا فریضہ ہے) اپنی کیسی اولوالعزمی، جانفشانی اور تحمل صدمات، مصائب کا ثبوت دیا اور کس تدبر اور ہوشمندی کے ساتھ

ساتھ مدرسہ کے کل پرزوں کو باہم مربوط رکھ کر اس فیض تعلیم و ترویج دین الٰہی کو بیش از بیش جدوجہد کے ساتھ شائع کیا جو مدرسہ کے بانیوں نے اس سے ارادہ کیا تھا

جن حالات کا اخبار کے چھپے ہوئے کالموں میں ضبط ہونا دشوار ہے اگر آپ ان پر اطلاع حاصل کرلیں تو آپ کو منکشف ہوجائے کہ دارالعلوم یا مولانا احمد صاحب کے متعلق جو کچھ آپ رجما بالغیب لکھ رہے ہیں، اس میں واقعیت کا کتنا حصہ شامل ہے:

خواہی کہ روشنت شود احوال سر عشق
از شمع پرس قصہ زباد صبا مپرس

میں تسلیم کرتا ہوں کہ مولانا احمد صاحب نے مسٹر گاندھی کی سی فداکاری، وطن پرستی اور ایثار کا کوئی ثبوت نہیں دیا، لیکن میرے نزدیک یہ مولانا کی تنقیص نہیں بلکہ تعریف ہے کہ وہ مدرسہ کے قدیم پیش رووں کی طرح ان الفاظ کے جدید اصطلاحی معنوں سے اب تک ناآشنا رہے۔

مہتمم مدرسہ ہوکر مشاہرہ چھوڑ دینا (جو شاید آپ کے نزدیک ایثار کا سب سے بڑا ثبوت ہے اور جس سے عجب نہیں کہ تاریخ معاوضہ لینے والے خلفا راشدین کو بھی محروم کردے) بیشک اس کی ہدایت اہتمام مدرسہ کے پچاس سالہ پرازیمن وبرکت عہد نے مولانا احمد صاحب کو نہ کی، لیکن شاید آپ کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب قبلہ نے چند ماہ سے تنخواہ ترک فرماکر ایک اسوہ حسنہ کی جو بنیاد مسلمانوں میں قائم کی ہے وہ مولانا احمد صاحب کے آٹھ دس سال تک کے اس متفقہ مشورہ کے بعد قائم ہوئی ہے، جس کی پہلی کڑی تو حضرت قبلہ مولانا محمود حسن صاحب کا ۳۵ سال سے برابر ارادہ کرتے رہنے کے بعد مشاہرہ سے علاحدہ ہونا ہے، اور دوسری اسی کی مانند وہ ہوگی جس پر جلد عمل کرنے کی فکر میں مولانا احمد صاحب لگے ہوئے ہیں۔

(اگرچہ مجھے یہ علم نہیں کہ ایسا کرنے کے بعد آیا مولانا احمد صاحب مہمانان مدرسہ کی ضیافتوں کا خرچ جو تقریباً تیس چالیس روپیہ ماہوار سے کم نہیں اور جس کا کوئی معاوضہ مولانا کو مریدانہ نذرانوں کی صورت میں بھی نہیں ملتا، اپنے ہی ذمہ رہنے دیں گے یا کیا)

اس موقع پر یہ واضح رہنا چاہیے کہ حیدر آباد کے منصب کو مدرسہ کے اہتمام سے کوئی تعلق نہیں اور حقیقت نگار کے ان غلط فہمی پیدا کرنے والے الفاظ کے جواب میں کہ "وہ حیدر آباد سے بصلہ تعلق مدرسہ وظیفہ پاتے ہیں۔" غالباً اس واقعہ کا ذکر کر دینا کافی ہوگا کہ فاضل نبیل و وارث آفتاب ہند مولانا حافظ محمد احمد صاحب ممدوح ۱۳۰۸ھ سے حیدر آباد کے منصب دار ہیں، حالاں کہ وہ مہتمم ۱۳۱۳ھ میں بنائے گئے، پھر اس کے بعد اگر منصب میں کوئی ترقی ہوئی تو اس کو بھی کیوں اس قسم کے ذرائع سے منسوب نہ سمجھا جائے، جو اصل منصب کے تقرر کا باعث ہوئے تھے؟ ہاں یہ ضرور ہوا کہ مولانا صاحب کے مساعی جمیلہ کے بدولت مدرسہ کا چندہ حیدر آباد سے سو روپے کی بجائے پانچ سو ہوگیا، **وسیصیر مضاعفا ان شاء اللہ العزیز**

حقیقت نگار کی اس بے خبری پر جیسا کہ ہم کو افسوس ہے، ایسے ہی اس کی یہ خفیف معیاری بھی قابل صد ہزار تعجب ہے کہ "اگر مولانا احمد صاحب تنخواہ ترک کر دیتے تو خیر آپ مسٹر گاندھی اور گوکھلے کی جگہ حضرت جنید و شبلی کی صف بھی آراستہ کر لیتے تو ہمیں کوئی عذر نہ تھا۔"

میں پوچھتا ہوں کہ کیا سچ مچ آپ کے نزدیک گاندھی اور گوکھلے کی پوزیشن تو ایسی گران قیمت ہے کہ مولانا احمد صاحب کو ان کی صف میں کھڑا کرنا آپ کو غضب ناک بنائے دیتا ہے، لیکن جنید اور شبلی کے کمالات و مقامات کی قدر و قیمت صرف اتنی ہی ہے کہ پچاس ساٹھ روپیہ ماہوار کی آمدنی سے دست بردار ہونے والا، ان کے مسند زہد و فقر پر قدم رکھنے کا مستحق ہو جاتا ہے سچ تو یہ ہے کہ

مشکل عشق نہ در حوصلہ دانش ما است
حل ایں نکتہ بدیں فکر خطا نتواں کرد

اصل یہ ہے کہ فضائل ومناقب کی لائنوں کو آپ نے پوری طرح سمجھا ہی نہیں ورنہ آپ ہر ایک کو اس کی صنف کمال کی لائن میں کھڑا کرنے کے خواہشمند ہوتے۔

دیکھ لو صحابہ کرام میں بحمد اللہ ایک سے ایک اعلیٰ افراد موجود تھے، لیکن زہد وفقر میں ابوذر کو، امانت میں ابوعبیدہ کو، اتباع سنت میں ابن عمر کو، تفقہ دینی میں ابن مسعو کو، تاویل وتفسیر میں ابن عباس کو، رحمت میں صدیق کو، صلابتہ وشدت فی الدین میں فاروق اعظم کو، حیا میں، عثمان غنی کو اور فضل قضایا میں حضرت علی کو امام طائفہ سمجھا گیا (رضی اللہ عنہم اجمعین ورضوا عنہ)

پس اگر فرض کر لو کہ مولانا احمد صاحب میں آپ کا فرضی ایثار یا جذبہ وطن پرستی پایا جاتا تو کیا ان کے ان تمام مناقب سے بھی چشم پوشی کی جاسکتی ہے، جن مین وہ ممتاز ہیں اور جن کے چمکتے ہوئے آثار ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے واحد مرکز "دارالعلوم دیوبند" کی پچھلی بست سالہ تاریخ میں محفوظ ہو چکے ہیں۔

۲۔ امر دویم کی نسبت ہم حقیت نگار موصوف سے اس قدر دریافت کرنے کی اجازت چاہتے ہیں کہ عطاء خطابات کے بارے میں گورنمنٹ کا جو طرز عمل آج تک آپ نے بتلایا ہے (یعنی بالعموم ان لوگوں کو خطاب دینا جو مقاصد عالیہ کے لیے سرا یا علانا خدمات انجام دے چکے ہوں یا ان سے اس طرح کے خدمات متوقع ہوں)، اگرچہ اس میں آپ نے مقاصد عالیہ کے لفظ کی کچھ تشریح نہیں فرمائی اور غالبا اس وقت آپ کے جذبہ حریت وسرفروشی پر مصلحت اندیشی غالب آگئی ہا لیکن بہر کیف اگر یہ واقعی ہے تو حضرت مولانا عبدالحی رحمت اللہ علیہ اور مولانا عبدالحق صاحب خیر آبادی مرحوم (جن کو خطاب دیے جانے کا آپ بھی اقرار کرتے ہیں) اس عام کلیہ کے تحت میں

داخل تھے یا نہیں اور جن استحقاقات کی بنا پر آپ کے نزدیک یہ خلعت عظمت مستحقین محترمین کے دوش خدمت پر راست آتا ہے، اس کے لحاظ سے ان دونوں بزرگوں کو خطاب دیا جانا تعجب انگیز اور خلاف توقع تھا یا نہیں؟ اگر تھا تو اس پر کیا تعجب ہے کہ گورنمنٹ آپ کے نزدیک جو غلطی دو دفعہ کر چکی ہے وہ ہی اس نے تیسری دفعہ مولانا محمد احمد صاحب کے معاملہ میں بھی کی؟

آپ نے بہت زور لگا کر یہ ثابت کرنا چاہا کہ "مولانا احمد صاحب کو خطاب کا دیا جانا سرجیمس میسٹن کے دیوبند تشریف لانے کے ساتھ وابستہ ہے۔"

ممکن ہے کہ ایسا ہو، لیکن مولانا محمد احمد صاحب کو ۱۹۰۵ء میں سرجیمس لاٹوس کی تشریف آوری سے چوں کہ یہ تجربہ ہو چکا تھا کہ "کسی لیفٹننٹ گورنر کا دیوبند میں آنا خطاب ملنے کا مرادف نہیں" اس لیے مولانا کا اس قسم کے خیال اور نیت سے خالی الذہن رہنا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے

۶ جنوری ۱۹۰۵ء کو آپ ہی کے الفاظ میں "دار العلماء والمتوکلین میں (سرجیمس لاٹوش) کا نزول اجلال مولانا احمد صاحب کی سرگرمی، درمیانی حضرات کی جدوجہد اور اس کے تمام کلیات وجزئیات کا مرقع، مدرسہ کے اندر عقیدت مندانہ انتظامات، دو رویہ جھنڈیوں کا تسلسل، وار دین وزائرین کا شد الرجال اور عرض نیاز کی عقیدت کیشی یا جواب لطف کی پذیرائی وغیرہ وغیرہ جو کچھ دیکھا گیا وہ اس سے ہرگز کم نہ تھا جو آپ نے اور آپ کے زہری اور سالم وغیرہ نے یکم مارچ ۱۹۱۵ء کو دیکھا۔ مگر حیرت ہے کہ اس وقت سے آج تک نہ تو کسی نے اس پر کوئی نکتہ چینی کی اور نہ کوئی پیشین گوئی!

اور اگر آپ اپنے زہری اور سالم سے دریافت کریں گے تو شاید یہ انکشاف بھی آپ کے لیے مشکل نہ ہو گا کہ ۱۹۰۵ء میں جو کچھ پیش آیا اس میں سب سے زیادہ قطب الوقت حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس اللہ سرہ کا دست کرامت کام کر رہا تھا، اور اس سے بھی کیا کم کہ حضرت رحمت اللہ علیہ اور آپ کے زہری وسالم سب اس کے نظم ونسق میں حصہ دار تھے۔

ایسی نظیر پیش آچکنے کے بعد مولانا احمد صاحب کو کیا حق تھا کہ وہ اپنے کو اپنے شیخ مولانا گنگوہی رحمت اللہ علیہ سے بھی زیادہ متقی اور دیندار ثابت کرتے اور اگر وہ ثابت بھی کرتے تو کون مانتا۔

حقیقت نگار موصوف ایڈیٹر ہمدرد سے (باوجود کہ ایڈیٹر موصوف خود شریک جلسہ تھے) فرماتے ہیں کہ "جن لوگوں نے یکم مارچ کے جلسہ کی کیفیت ملاحظہ کی تھی انھوں نے یکم مارچ کی صبح ہی کو وہ سب کچھ دیکھ لیا تھا جو آپ نے یکم جون کو دیکھا "لیکن میں بہت زیادہ خوش ہوتا اگر آپ یوں فرماتے کہ "دیکھنے والے ۱۹۰۵ء کے شروع میں ہی وہ سب کچھ دیکھ چکے تھے جو اوروں نے ۱۵ء کے وسط میں دیکھا۔"

بلکہ اس سے بھی زیادہ اگر دوربینی سے کام لیا جائے تو یوں کہا جائے کہ مولانا احمد صاحب کے اس فعل کی داغ بیل مہتمم سابق حضرت مولانا رفیع الدین صاحب رحمت اللہ علیہ اپنے زمانے میں لگا چکے تھے، جب کہ ان کے عہد میں آرڈن صاحب کلکٹر سہارنپور مدرسہ میں مدعو کیے گئے اور خاص صدر مدرس صاحب کی درس گاہ حدیث میں ان کی نشست کی جگہ ان کی کرسی اور میز لگائی گئی، سپاس نامہ پیش ہوا اور مہتمم صاحب مع ممبران مدرسہ مودب کھڑے رہے۔ یہ زمانہ تھا کہ جناب مولانا محمد احمد صاحب صرف ابتدائی درجہ کے مدرس تھے اور ان کو کسی انتظام واہتمام میں دخل نہ تھا۔ (گو نتیجتاً یہ سارا سبق ان ہی کو پڑھایا جارہا تھا)

حضرت مولانا محمد قاسم قدس سرہ کے عہد مبارک میں لیفٹننٹ گورنر کے سیکرٹری صاحب کا مدرسہ میں تشریف لانا، ان کے معائنہ کا ترجمہ بعنوان "بشارت" مدرسہ کی جانب سے طبع ہونا اور حضرت مولانا رحمت اللہ علیہ کا اس پر اظہار مسرت فرمانا (۱) یہ سب امور مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے آچکے اور مطبوع ہو کر پبلک میں مشتہر ہو چکے، پھر دارالعلوم میں جن باتوں کی مثال حضرت

---

(۱) جس کے گواہان ثقات ابھی تک زندہ ہیں

مولانا محمد قاسم حضرت مولانا رشید احمد حضرت مولانا رفیع الدین حضرت مولانا محمد یعقوب قدس اللہ اسرارہم، یہ سب حضرات قائم کرچکے، آج اسی قسم کے واقعات سے مولانا حافظ محمد احمد صاحب کو کیوں مطعون اور ملام ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ اور کیوں ان مقدس لوگوں کو تکلیف دی جاتی ہے کہ وہ اپنے اپنے مزاروں سے تشریف لاکر اپنے خلف رشید کا اور اپنی باقیات صالحات کا حال دیکھیں، مولانا احمد صاحب تو باآواز دہل کہہ سکتے ہیں، اتبعت ملت آبائی ابراھیم و اسحاق و یعقوب

صوفیاں جملہ حریفند و نظر باز و لے
زیں میاں حافظ دل سوختہ بدنام افتاد

میں چاہتا ہوں کہ اس جگہ بطور نمونہ ۱۹۰۵ء کے ایڈریس اور اسپیچ کے چند اقتباسات جن کو بقول حقیقت نگار "عرض نیاز کی عقیدت کیشی میں کچھ دخل ہو" نقل کردوں۔ ناظرین ان کو بہت تعمق کی نگاہ سے دیکھیں اور معلوم کریں کہ موجودہ زمانہ کی نزاکت کو خیال کرتے ہوئے مولانا محمد احمد صاحب کی عقیدت کیشی حضرت مولانا رشید احمد رحمت اللہ علیہ کی عقیدت کیشی سے کیا واقعی کچھ بڑھی ہوئی ہے۔

۱۹۰۵ء کی ایڈریس کا یہ فقرہ ملاحظہ ہو کہ

"مسلمانوں کو علوم مروجہ کی تعلیم کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے اعلیٰ اور پاکیزہ اصول صبر و قناعت، راست بازی، استقلال، توکل، دیانتداری، اطاعت و فرمانبرداری اولی الامر و فرمانروائے وقت کی عملی تعلیم بھی اس طرح دی جاتی ہے کہ یہ اخلاق ان میں راسخ ہوکر طبیعت ثانیہ اور جزو لاینفک بن جاتے ہیں، جو طالب علم کہ اس مدرسہ سے پوری تعلیم حاصل کرکے نکلتا ہے وہ اپنی علمی، عملی، اخلاقی حالت سے ایسا رہنما ہوتا ہے کہ جہاں جاتا ہے علم مذہب کی ساتھ ان اوصاف کو بھی پھیلاتا ہے۔ یہ اسی تعلیم کا اثر ہے کہ یہاں

کے تعلیم یافتہ باوجود مذہب کے نہایت پابند بلکہ ہادی اور پیشوا ہونے کے اپنی گورنمنٹ کی وفاداری اور اطاعت میں ایسے ثابت قدم ہوتے ہیں کہ آج تک کسی ایسے پولیٹکل معاملہ میں جس میں کچھ بھی بوخلاف منشاء گورنمنٹ پائی جاتی ہو، شریک نہیں سنے گئے۔

پھر دوسری جگہ لکھا ہے کہ

"یہ خلاصہ احوال مدرسہ کا ہے جو عرض کیا گیا لیکن یہ جو کچھ ہوا یا آیندہ جو کچھ ہو گا مدرسہ نے جو کچھ ترقی کی یا آیندہ کرے، ہماری مہربان اور عدل گستر گورنمنٹ کے پاکیزہ اصول کا ثمرہ ہے۔" الیٰ آخرہ...

ان ہی مضامین کو ۱۹۱۵ء کے ایڈریس میں بایں الفاظ ادا کیا گیا ہے کہ

"حضور والا! دار العلوم کے اصول میں یہ جزو بھی لازمی قرار دیا گیا ہے کہ اس کے ارکان، اساتذہ، طلبہ ہر قسم کے نزاعی معالات اور سیاسی الجھنوں سے (جن کا تعلق مذہب سے بہت ہی شاذ ہوتا ہے) مجتنب رہیں اور اپنے ایک واحد مقصد (تکمیل تعلیم مذہب) کے ساتھ کسی دوسرے مقصد کو شامل نہ کریں۔"

پھر چند سطر کے بعد لکھا ہے کہ

"غیر ضروری سیاسی اور نامناسب ملکی معاملات میں حصہ لینا علاوہ اس کے کہ نفس تعلیم میں حارج ہے، خود ملک و قوم کے لیے بہ نسبت فائدہ کے نقصان رساں زیادہ ہے اور اگرچہ کسی وقت تعلیمی جماعت کا اس قسم کی عبث پیچیدگیوں میں پڑنا بظاہر سود مند بھی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن انجام کار مضر ہے۔ کیوں کہ پالیسی میں اکثر انقلاب ہوتا رہتا اور رائے ہمیشہ بدلتی رہتی ہے، اور اسی لیے یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ مذہبی جماعت کے لیے اپنے ناممکن التغیر سیاست وعزت کا باقی رکھنا ہی سب سے بڑا نصب العین ہے۔"

پھر چند صفحات کے بعد لکھا ہے کہ

"یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ آج تک کبھی یہ نہیں سنا گیا کہ اس دار العلوم کے کسی فیض یافتہ نے کسی نامناسب نزاعی یا سیاسی

معاملہ میں حصہ لیا ہو' حالاں کہ انھوں نے اپنے اساتذہ کی پیروی میں کسی وقت بھی خالص مذہبی معاملات کی نسبت مداہنت برتنے یا صاف گوئی اور صداقت طلبی سے بھی باز رہنے کی کوشش نہیں کی اور ہمیشہ انھوں نے اپنے مسلک کے فنا کر دینے کو اس کے بدلنے سے بہتر سمجھا۔"

پھر لکھا ہے کہ

"حضور والا! دار العلوم نے اپنے مذکورہ بالا مستحکم اصول کو اپنا نصب العین بنا کر اب تک اپنی معتدل' خاموش اور ناقابل تزلزل رفتار میں گورنمنٹ عالیہ کے ساتھ نہایت راست بازی اور صدق و دیانت سے اعلیٰ وفادارانہ معاملہ کیا ہے۔ اس نے گورنمنٹ کی اطاعت اور اس کے احکام کی تعمیل کو لازمی سمجھا ہے۔ وہ اور اس کے ارکان کبھی گورنمنٹ کی مشکلات میں اضافہ کا سبب نہیں بنے' نہ اس نے کبھی اس کا اقدام کیا کہ خلاف واقع یا خلاف دیانت و راست بازی کوئی بات قوم کے یا گورنمنٹ عالیہ کے روبرو پیش کرے' اس نے ہر موقعہ پر اعتدال وسکون کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کی کوشش کی ہے کہ اپنی وفاداری کا ایسے پیرایہ میں یقین دلائے کہ اندر سے خود اس کا ضمیر اس پر نفرین نہ کرے' بلکہ جتنی بات وہ منہ سے نکالے۔ اپنے خدا اور اپنے مذہب کا فرمودہ سمجھ کر نکالے۔"

پھر لکھا ہے کہ

"نہایت ناشکری ہوگی اگر ہم بصدق دل اس کا اعتراف نہ کریں کہ دار العلوم کی یہ کامیابیاں گورنمنٹ عالیہ اور لوکل حکام کی خاص مہربانیوں کے نتائج وثمرات ہیں۔"

ان مذکورہ بالا مختصر اقتباسات سے آپ نے اس کا اندازہ لگالیا ہوگا کہ جو بات جس صفائی کے ساتھ دس برس پہلے کہی گئی تھی اس سے زائد کوئی بات آج دس برس کے بعد نہیں کہی گئی' چناں چہ اس کے جواب میں جس طرح کا وعدہ ہز آنر سر جیمس لاٹوس نے ان الفاظ میں فرمایا تھا کہ "مجھے مدرسہ یاد رہے

گا اور اگر مدد کی ضرورت ہوئی تو مدد دوں گا۔" اسی کے لگ بھگ ہز آنر سر جیمس میسٹن نے اپنے اسپیچ کے اس جملہ میں فرمایا کہ

"اے میرے دوستو! میں خود یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی دنیوی طریقہ سے آپ کی امداد و اعانت کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ شاید یہ آپ کو ناگوار گزرے لیکن آپ خوب جانتے ہیں کہ اگر آپ کی طرف سے کبھی امداد کی خواہش کی جائے گی، تو میں کامل طور پر اور بکشادہ دلی اس کے پورا کرنے کی سعی کروں گا اور اس کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔"

یہاں تک ہم نے حقیقت نگار کی معلومات پر جو کچھ ریمارک کیا، وہ اصولی اور کلی طور پر تھا جزئی غلط بیانیوں یا مبالغہ آمیزیوں کے متعلق جو حقیقت نگار سے سرزد ہوئیں (مثلاً اسٹیشن سے مدرسہ تک دورویہ جھنڈیوں کا (منجانب مدرسہ) نصب ہونا یا اس زور سے چیئرز دیا جانا کہ علی گڑھ کا اسٹریچی ہال بھی اس کے سامنے ماند پڑ گیا، اور علما و فقہاے عظام پر ایسا عالم تواجد و تراقص طاری ہوا کہ بے اختیار عقدہ تشبہ کی پنجاہ سالہ تعقید خود بخود حل ہوگئی۔) میں اس کے سوا کیا کہہ سکتا ہوں کہ اگر واقعی آپ نے اپنے ذاتی مشاہدہ کی بنا پر ایسا لکھا ہے تو ہزاروں اشخاص کے مشاہدات اس کی تکذیب کر سکتے ہیں اور اگر آپ نے خود بلا واسطہ نہیں دیکھا، تو میں معاف کیا جاؤں اگر یہ کہوں کہ آپ کے وہ زہری کے ہم پایہ روات جن کے ذریعہ سے آپ کو اس قسم کی روایات دستیاب ہوئی ہیں، جابر جعفی سے بھی زیادہ کذاب ہیں، **ولا تقف ما لیس لک بہ علم ان السمع و البصر و الفواد کل اولائک کان عنہ مسئولا۔**

واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۰۵ء میں سر جیمس لاٹوش نے اثنائے اسپیچ میں خود بھی اور ان کے یمین و یسار دونوں طرف کے لوگوں نے (باستثنائے مہتمم صاحب و ارکان دارالعلوم) متعدد چیئرز دیے اور اس دفعہ سر جیمس میسٹن کی تشریف آوری کے موقعہ پر خود ہز آنر نے اور ان کے داہنی طرف کے لوگوں نے جن میں عموماً علماے کرام اور منتظمین دارالعلوم تھے اور طلباے مدرسہ نے ایک

مرتبہ بھی چیئرز نہیں دیا۔ ہاں! اصحاب شمال نے جن میں بکثرت شہر کے برادران ہنود تھے خاتمہ تقریر پر چیئرز دیا۔

اس اعتبار سے اگر حقیقت نگار کو ۱۹۰۵ء کا صحیح واقعہ معلوم ہوتا تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ ۱۹۰۵ء میں عقدہ تشبہ کی جو گرہ ذرا سا ڈھیلی ہوگئی تھی علمائے کرام نے ۱۹۱۵ء میں اس کو پھر کس دیا۔

ان کھلے ہوئے واقعات کے نہ جاننے پر بھی اگر کوئی حقیقت ناشناس حقیقت نگار بننے کا دعویٰ کرے تو واقفیت رکھنے والوں کے نزدیک یہ امر بہت ہی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔

مولانا احمد صاحب نے تو جو کچھ کیا، نیک نیتی اور ہمت سے کیا، اپنے بزرگوں کے اصول عمل کے موافق کیا، دارالعلوم کے مقاصد کے تحفظ وبقا کے واسطے کیا، اور وہ کیا جو اس نازک زمانہ میں ایک دردمند دارالعلوم کو کرنا چاہیے تھا، لیکن اس پر بھی اگر کوئی شخص بجائے ان کے ممنونیت کے آفتاب روشن پر خاک ڈال کر اسے میلا کرنا چاہے تو اسے یاد رکھنا چاہیے کہ مولانا احمد صاحب کو اپنی مدح وذم کی کچھ بھی پروا نہیں ہے، بشرطیکہ ان کے اصلی محبوب اور حقیقی مطلوب کی رضا جوئی میں خلل نہ آئے۔ ان کا مسلک تو یہ ہے کہ

زبادشاہ وگدا فارغم بحمد اللہ
گدائی خاک دردوست بادشاہ من ست
غرض زمسجد ومیخانہ ام وصال شما است
جز ایں خیال ندارم خدا گواہ من است

اسی سلسلہ میں حقیقت نگار کی اس خوش فہمی کا تذکرہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ وہ "عالی جناب نواب احمد سعید خان صاحب رئیس چھتاری کو (جو ایک روایتی خطاب یافتوں کے خاندان سے ہیں) نواب کا خطاب دیا جانا بھی اسی ایاب وذہاب اور توسط وتوسل کی حیثیت سے منسوب سمجھتا ہے، جو نواب

صاحب ممدوح نے سر جیمس میسٹن کے ورود دیوبند کے موقعہ پر ظاہر فرمائی۔"

میں اس کے متعلق آپ کو صرف اس قدر آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ دارالعلوم کے جس تعلق کا صاف رکھنا گورنمنٹ ہند کے ساتھ بحیثیت اس کے زیر حکومت ہونے کے ضرور ہے، اس کی نگہداشت کا فرض ہمیشہ سے نواب صاحب ممدوح کے خاندان کا خاصہ رہا ہے۔ ۱۹۰۵ء میں بھی سر جیمس لاٹوس کو دارالعلوم کے معائنہ پر آمادہ کرنے اور اس کی ہر قسم کی کلیات و جزئیات کو سرانجام دینے والے اسی خاندان کے ایک رکن اعظم عالی جناب محمد یوسف علی خان مرحوم مغفور تھے۔

پس اگر دارالعلوم کی ایک اہم خدمت بجالانے میں نواب احمد سعید خان صاحب نے اپنے مرحوم چچا کی اور نواب عبد الصمد خان صاحب نے اپنے بڑے بھائی کی پیروی کی تو ہمارے واسطے کون سی دلیل ہے کہ ہم ان کے اس فعل کو بھی خطاب حاصل کرنے کی نیت پر ہی خواہی نخواہی محمول کریں۔

اور اگر ان کو اس عمل کے صلہ میں خدا تعالیٰ نے ثواب کے ساتھ خطاب بھی دلوایا ہو (جو بظاہر دنیوی نقطہ نگاہ سے ایک معزز رئیس کے حق میں بہت بڑا فوز مرام سمجھا جاتا ہے) تو یہ اس کا ثبوت ہو گا کہ دارالعلوم کے برکات اپنے خدمت کرنے والوں کو اجر آخرت کے ساتھ دنیوی کامیابی سے بھی محروم نہیں رکھتیں ـ ...

۳۔ امر سویم یعنی جلسہ سہارنپور کی جو اصلیت آپ نے زہری عن سالم عن ابیہ کی سند سے بیان کی ہے، اس کو دیکھ کر میں یہ کہنے میں معذور ہوں کہ تنقیح روایات اور نقد رجال کا فن ایک نہایت مشکل فن ہے اور اسی لیے غالبا اس کے دقائق تک ہمارے حقیقت نگار کی دسترس نہ ہو سکی۔

اس کو تنقید رجال کے وقت یہ قاعدہ بھی فراموش نہ کرنا چاہیے کہ اقران کی محبت وعداوت بسا اوقات جرح وتعدیل کو بے اثر بنا دیتی ہے۔

اس کے علاوہ حقیقت نگار کا یہ فرض تھا کہ وہ خود اپنا نام ظاہر کرتا کیوں کہ

جن لوگوں کو اس نے زہری اور سالم کے برابر سمجھا ہے، مان لو کہ وہ ایسے ہی ہوں، لیکن پھر بھی تو خود حقیقت نگار کی جہالت ہمارے نزدیک روایت کو مخدوش بنانے کے لیے کافی ہے۔

حدیث میں آیا ہے کہ شیاطین وحی الٰہی کے سننے کے واسطے آسمان کی طرف چڑھتے ہیں اور جو ایک آدھ بات وہاں سے اچک لیتے ہیں، اس کے ساتھ سو جھوٹ ملا کر اپنے اتباع کے روبرو پیش کر دیتے ہیں، تو دیکھ لو کہ ان کی روایت کا اصل ماخذ کس قدر پاک وصاف ہے لیکن خود ان کے توسط نے خبر کو کس قدر گندہ اور بے اعتبار بنا دیا ہے۔

پس ہمارے پاس اس کے باور کر لینے کی کیا ضمانت ہے کہ آپ کے زہری سے روایت کرنے والے بھی مالک ہی ہیں۔

نفس واقعہ کی تحقیق جس کی سند پر آپ نے خواہ مخواہ اتنا زور دیا بالکل آسان تھی، اخبار مشرق گورکھپور میں اس واقعہ کی مختصر سی اصلیت خود جناب مہتمم صاحب کی طرف سے ظاہر کر دی گئی تھی۔

بلاشبہ ممکن ہے کہ حضرت مہتمم صاحب نے جو تقریر جلسہ سہارنپور میں ایک حاکم وقت کے سامنے کی اور ترکی کے ساتھ اپنی ہمدردی اور اخوت اسلامیہ کا پرزور لہجہ میں اظہار کیا، اور ان کی تکلیف وراحت کے ساتھ اپنی تکلیف وراحت کو وابستہ بتلایا، اس میں وہ ہندوستان بھر کے اندر منفرد نہ ہوں لیکن اس میں بھی کلام نہیں ہو سکتا کہ اس مجمع میں کہ جس میں عام طور پر گورنمنٹ کے ضرورت سے زیادہ خیر خواہ ترکوں سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کر کے حکام کو متاثر بنا رہے تھے، جناب مہتمم صاحب ایسی آزادانہ صداقت کے اظہار میں ضرور منفرد تھے۔

بہر حال مولانا احمد صاحب اس میں منفرد تھے یا نہیں، لیکن اس میں تو آپ کو بھی شبہ نہیں کہ مولانا نے ایک سچی بات کہی، اور جب وہ سچی بات مذہبی مرکز کے ذمہ دار کی زبان سے ادا ہوئی تو قدرتی طور پر اہم ہو گئی۔

۴۔ امر چہارم کے ضمن میں حقیقت نگار نے خطاب کے قبول کرنے سے اس پر استدلال کیا ہے کہ "مولانا محمد احمد صاحب کو بیشک خطاب کی ضرورت وخواہش تھی، حالاں کہ ایک عالم دین کی سب سے بڑی عزت انقطاع (عن الخلق) میں ہے بلکہ عالم دین ہونے کے لیے سب سے بڑی شرط یہی ہے، ان کو دنیا کے ظواہر سے کیا سروکار۔"

خدا کی قدرت کہ علما پر رہبانیت، تنگ خیالی اور کنج خلوت میں بیٹھے رہنے کا الزام لگانے والے آج ان کو انقطاع اور ظواہر سے علاحدہ رہنے کی نصیحت کرتے ہیں۔

آپ کی اس نصیحت کو، غالبا مولانا محمد احمد صاحب نہایت ممنونیت کے ساتھ سنیں گے (اگرچہ آپ کا قبول خطاب سے خواہش خطاب پر استدلال ان کے نزدیک غلط ہو۔)

یہ بالکل درست ہے کہ ایک عالم دین کی اصلی عزت دنیا سے علاحدہ رہنے ہی میں ہے، اور علما کے جو حالات آپ نے احیاء العلوم وغیرہ میں پڑھے ہیں وہ بھی سب درست ہیں، مگر مولانا احمد صاحب فقط عالم دین ہی نہیں وہ ایک دارالعلوم کے مہتمم بھی ہیں۔

اس کے علاوہ آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ مولانا جامی قدس سرہ نے اپنے شیخ خواجہ عبید اللہ احرار کے شاہانہ ٹھاٹھ کو دیکھ کر جب یہ کہا تھا کہ "نہ مرد است آں کہ دنیا دوست دارد" تو حضرت خواجہ صاحب رحمت اللہ علیہ نے اس کے جواب میں یوں فرمایا تھا کہ "اگر دارد برائے دوست دارد"

بلاشبہ اب بھی دیوبند سے تقشف مذہبی کی وہی صدائیں اٹھتی ہیں، اور انشاء اللہ برابر اٹھتی رہیں گی، اور نئے طریقوں پر کام کرنے والوں کے حق میں وہی فتوے نکلتے رہیں گے، جو پہلے نکلتے تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ایسے اعتراضات سے متاثر ہوکر دارالعلوم کے جائز فوائد کو ملیامیٹ کردیا جائے گا، یا اس کے تعلقات کی ترقی پذیر وسعت کو گھٹا دیا جائے گا۔

دارالعلوم میں ایسے لوگ بھی آئے، جو دریا ہیں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنے کی رائے دیتے تھے۔ انھوں نے گورنمنٹ کی رعایا بن کر دارالعلوم کے احاطہ میں اس سے بائیکاٹ کرنے کی تحریک کی اور وہاں کے ارکان کو کانگریس وغیرہ کی شرکت کی طرف توجہ دلائی، لیکن اس قسم کی ساری عیارانہ مساعی، دارالعلوم کے مہتمم اور اس کے بے لوث مسلک رکھنے والے اعضا نے بالکل باطل کر دیں اور شاید یہ تحریر جو زمیندار میں اب شائع ہوئی ہے، یہ بھی ان ہی سعی کرنے والوں کی آواز بازگشت ہو۔

خوب یاد رکھو کہ ہم نہ باغی ہیں نہ مفسد اور نہ ہم کو وفاداری کا ہیضہ ہے ہاں! مرضات الٰہی اور سلف کے نقش قدم پر چلنے کے بحمد اللہ بدل وجان متمنی ہیں اور خدا تعالیٰ کی حول وقوت سے ہر ایک امتحان کے وقت اپنے ثابت قدم رہنے کی امید رکھتے ہیں، جس وقت کہ بڑے بڑے بہادروں کے قدم لغزش کھا جائیں تو بعید نہیں۔

اذا اشتبکت دموع فی خدود تبین من بکی ممن تباکا

(ترجمہ) "جس وقت آنسوؤں کی لڑیاں رخساروں پر گتھ جائیں گی تو پتہ چل جائے گا کہ کون روتا ہے اور کون بسورتا ہے۔"

آخر میں اس قدر اور گذارش کر کے آپ سے رخصت ہونا چاہتا ہوں کہ آپ نے جناب حاجی محمد عابد صاحب مرحوم کے زہد (ترک تنخواہ) اور آزادانہ رویہ (بیگم بھوپال کے سامنے سپاسنامہ پیش نہ کرنے کو بہت سراہا ہے۔

حالاں کہ حضرت حاجی صاحب مرحوم اگر تنخواہ نہیں لیتے تھے تو اپنے تعویذ، گنڈہ وغیرہ کے مشغلہ سے وہ بہت ہی کم وقت مدرسہ کی کاموں کے لیے بچا سکتے تھے اور اسی لیے برخلاف مہتممین سابقین ان کو ایک نائب معقول تنخواہ کا رکھنا پڑتا تھا۔

سپاسنامہ اگر انھوں نے بیگم صاحبہ کے سامنے پیش نہیں کیا تو وہی سپاس نامہ حضرت قبلہ مولانا محمود حسن صاحب دامت برکاتہم نے ان کو سنایا حضرت

مولانا رفیع الدین صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے آسمان جاہ نواب بشیر الدولتہ مرحوم سابق مدار المہام حید آباد دکن کو ایڈ ریس دیا۔ حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب رحمتہ اللہ علیہ نواب مالیر کوٹلہ کے پاس مدرسہ کے چندہ کی کوشش میں تشریف لے گئے اور خود حضرت مولانا محمد قاسم صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی قدس سرہ کا نامہ مبارک دے کر دیوان محمد یٰسین مرحوم کو نواب کلب علی خاں بہادر مرحوم کے پاس مدرسہ کے لیے بھیجا۔

پس اگر یہ مقدس حضرات (عیاذاباللہ) غیر اللہ کے سامنے سر نیاز جھکاتے تھے تو تنہا حضرت حاجی صاحب کی ایک نظیر ہم کورؤساء کے تعلقات اور مولانا محمد قاسم رحمتہ اللہ علیہ کے لکھے ہوئے اس اصول سے کہ "مہتمم وارکان مدرسہ کاسب سے بڑا فرض تکثیر چندہ کی کوشش ہے" کس طرح بے نیاز بنا سکتی ہے دراں حالے کہ تم یہ بھی دیکھ رہے ہو کہ حضرت حاجی صاحب مرحوم کے طرز عمل سے دارالعلوم نے کیا ترقیات حاصل کیں اور ان حضرات کے نقش قدم پر چلنے سے کیا

اولائک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ

الراقم

شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ از دارالعلوم دیوبند

۱۳۔ رمضان المبارک ۱۳۱۳ھ

ضمیمہ چہارم:

مولوی عبید اللہ سندھی صاحب

جمعیت الانصار کی نظامت سے علاحدگی

۱۳۳۱ھ میں آسمان سے سطح دنیا پر جن حوادث کی بارش ہوئی، ان کا زیادہ حصہ سلطنت ترکی کی قسمت میں آیا۔ اس کو بدنصیبی کہیے یا خوش قسمتی، بداقبالی سے تعبیر کیجیے یا خوش اقبالی کا بیدار کن جھونکا۔ غفلت و کاہلی کی پاداش سمجھیے یا فہم وفراست کی ابتدائی تعلیم کا زینہ!

عالم میں جو نیرنگیاں صبح وشام نظر آتی ہیں، یہ از خود نہیں ہیں، بلکہ نقش بند کاخ ہستی کی قدرت اور حکمت کا دریا متموج اور متلاطم ہے کہ کوئی ڈوبتا ہے اور کوئی تیرتا ہے۔ اس سے تعلیم گاہیں بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہیں۔ علی گڑھ کالج سے نواب وقار الملک کی سبک دوشی، ندوہ سے حضرت شبلی کی علاحدگی، جمعیت الانصار سے مولوی عبید اللہ صاحب کی برطرفی، یہ سب ۱۳۳۱ھ کی جدت پسندیاں ہیں۔

مذکورہ بالا انقلاب کی یہ سب تصویریں اخباری کالموں میں دنیا کے روبرو پیش ہو چکی ہیں۔ مگر ناظم جمعیت الانصار کی علاحدگی کا مسئلہ اب تک اخباری دنیا میں تفصیل کے ساتھ اشاعت پذیر نہیں ہوا، صرف ایک مرتبہ اخبار رفیق دہلی میں حضرت ناظم نے اپنا استعفا شائع کیا تھا، ہاں! نظارت المعارف کے اجرا

المعارف کے اجرا کے متعلق چند مضمون اخباروں میں نظر سے گزرے۔ ان سے یہ سمجھ لینا شاید سہل ہو کہ حضرت ناظم جمعیت سے جدا ہو گئے ہیں۔

سوال یہ پیش کیا جاسکتا ہے کہ جمعیت الانصار یا دارالعلوم دیوبند میں حضرت ناظم کی علاحدگی کا مفصل اعلان کیوں نہ کیا؟ کیا اس کا اخفا کسی مصلحت کی بنا پر ہے؟ بے شک اعلان کی ضرورت تھی، مگر چوں کہ حضرت ناظم نے خود اخبار رفیق میں اپنا مفصل استعفا شائع کر دیا تھا اس لیے ہم نے عجلت اور سبقت کو مناسب نہ سمجھا۔ حضرت ناظم کا مختصر اور مجمل استعفا گو ناواقف حضرات کی نظروں میں واقعات اور حقیقت الحال کے بتلانے سے قاصر ہے۔ مگر نفس علاحدگی کے اظہار میں وہ ساکت نہ تھا اور معاملہ فہم حضرات نے تو حضرت ناظم کی ان خصوصیات اور امتیازات کو جو دارالعلوم دیوبند سے ان کو حاصل تھیں اور ان کی اس عقیدت کو جس کا اظہار تمام دنیا کی درس گاہوں اور دینی جماعتوں کے مقابلے میں دارالعلوم دیوبند اور بزرگان دیوبند کی اس نوازش کو جو حضرت ناظم کے حال پر مبذول تھی، پیش نظر رکھ کر استعفے کے اختصار اور اجمال کو حقیقت فہمی کے مخل اور مانع نہ سمجھا، بلکہ بہ قول مرزا غالب:

بے خودی بے سبب نہیں غالب
کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اجمالاً حقیقت تک پہنچنا آسان ہو گیا، اور اجمال عند التفصیل نے ایسا اطمینان بخشا کہ ان کو بزرگان دیوبند سے استفسار کی اجازت بھی نہ دی اور اگر استفسار کی نوبت بھی کسی کو آئی تو تبلیغ واقعہ کے بعد کشف شبہ فوراً ہو گیا۔

ہم نے مطبوعہ اعلان کیوں نہیں شائع کیا؟ اس لیے کہ اراکین مجلس انتظامیہ کے چند مطالبات حضرت ناظم سے باقی تھے۔ ان کا صحیح جواب اور تکمیل ہوئے بغیر اس مسئلے کا زیر بحث آنا اراکین جمعیت الانصار اور دیگر اہل اسلام پر ایک معاملے کی حقیقت کا پورا انکشاف کہ جس کے بعد کسی سوال اور کنج وکادکی

ضرورت باقی نہ رہے، نہیں کرسکتا تھا اور بعض معاملات کی گھٹاٹوپ تاریکیوں کو آسانی کے ساتھ نہیں پھاڑا جاسکتا تھا

مطالبات کے جواب میں حضرت ناظم کا اب تک سکوت اور بعض اراکین جمعیت ودیگر اہل اسلام کے استفسارات محرک ہیں کہ حضرت ناظم کا استعفا اور اراکین مجلس انتظامیہ کی اس پر تجویز القاسم میں شائع کردیے جائیں۔ اس کے بعد اگر اور تفصیل کی ضرورت باقی رہے تو مطالبات کے جوابات کا آئندہ انتظار نہ کرکے کسی دوسرے پرچے میں اور کچھ واقعات کی واقعی تصویریں کھینچ دی جائیں اور ناظرین ان کے معائنے سے تحیر کے عالم میں حقیقت کو سمجھتے رہیں۔

نقل استعفا مولوی عبید اللہ صاحب سابق ناظم جمعیت الانصار

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

امابعد!

بخدمت شریف جناب مولانا امیر جمعیت الانصار دام برکاتہم

بعد سلام مسنون! معروض آنکہ جلسہ انتظامیہ کے تمام ممبر جہاں تک مجھے معلوم ہوا، میری نسبت اچھے خیالات نہیں رکھتے۔ اگر جامعۃ القاسمیہ تک معاملات کا مرافعہ کیا جائے اور میں اپنی برات ثابت کرلوں تو بھی اتفاق سے کام چلانا مشکل ہے۔ لہٰذا جمعیت الانصار کی خدمت سے استعفا پیش کرتا ہوں۔ اس کے بعد مجھے جمعیت الانصار کے کسی شعبے سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور اپنے معالات کا ذاتی حیثیت سے ذمہ دار ہوں گا۔

جناب والا! جس قدر جلد ممکن ہو منظور فرماکر اعلان کی اجازت مرحمت فرمادیں گے۔ تاکہ مجھے اپنے طور پر کام کرنا آسان ہوسکے۔

والسلام"

حضرت ناظم نے یہ استعفا جناب مولانا حبیب الرحمن صاحب سرپرست اور امیر الجمعیت کی خدمت میں (۴ جمادی الثانی ۱۳۳۱ھ / ۱۱۔

مئی ۱۹۱۳ء کو) پیش کیا اور اور دیوبند سے پنجاب کو تشریف لے گئے۔

حضرت ناظم خود اصرار کرتے ہیں کہ جلسہ انتظامیہ کے تمام ممبر میری نسبت اچھے خیالات نہیں رکھتے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ کلیہ اراکین مجلس انتظامیہ کا تقرر حضرت ناظم کی سفارش پر ہوا تھا۔ حضرت ناظم کو ان پر اس قدر اعتماد تھا کہ اپنی باگ ان کے ہاتھ میں دے دی۔ ان کی دیانت، قابلیت، اہلیت کا اعتراف بار بار فرمایا کرتے تھے اور یہ وہی اراکین ہیں کہ جنھوں نے ابتدا سے حضرت ناظم کی نظامت میں کبھی مخالفت نہ کی، کوئی تحریر ان حضرات کی اس باب میں پیش نہیں کی جاسکتی، کسی تقریر کا حوالہ نہیں دیا جاسکتا۔ باوجود اختتام مدت نظامت انھوں نے کبھی ناظم صاحب کی نظامت کی چلتی گاڑی میں کوئی روڑا نہ اٹکایا، برابر حضرت ناظم صاحب کے ساتھ مل کر قواعد کی پابندی کے ساتھ کام کرنے کے متمنی رہے، ان سب کا اجماعاً حضرت ناظم کی نسبت اچھے خیالات کا نہ ہونا ایک ایسی مجمل بات ہے، جس کی تفصیل کی ضرورت تھی اپنی بے خطائی کا ثبوت اور اراکین کی خطا کاری کا اثبات جس کا استعفا میں ادعا ہے، کیا ایسے بھاری بھرکم عہدے دار پر ضروری نہ تھا؟

الجامعتہ القاسمیہ میں مرافعہ ہوکر اگر حضرت ناظم کی برات ثابت ہوجاتی تو بھی اتفاق سے کام نہ چلتا، یہ بھی ایک چیستان ہے کہ اراکین انتظامیہ کی نسبت الجامعتہ القاسمیہ کے فیصلے سے سرتابی کا خیال حضرت ناظم صاحب کے دل میں نہ گزرنا چاہیے تھا۔ واقعات نے حضرت ناظم کے روبرو وپے ہم شہادتیں پیش کر دی تھیں اور

بہ بیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

کے معنی سمجھانے میں سر مو کوتاہی نہ کی تھی۔ اراکین انتظامیہ جمعیت الانصار کی زراعت کے دخیل کار اور موروثی کاشت کار نہ تھے کہ حضرت ناظم کو ان کی بے دخلی میں مصائب کا سامنا ہوتا۔ ان کی رکنیت وقت حضرت ناظم کی نظامت موقت غیر معلوم المنتہی سے مقابلہ نہ کر سکتی تھی اور نہ معلوم ایسی کیا

مشکل پیش آئی تھی کہ چند ماہ کا صبر نہ ہوسکا اور جمعیت کو زیر باری کی حالت میں چھوڑ کر قطع تعلق گوارا کیا جوان کی اولوالعزمی، عالی حوصلگی، ہمہ گیری، بلند پروازی، روشن خیالی، تحمل، وقار، اطمینان کے کسی طرح شایان نہیں۔

استعفے کا آخری جملہ (تاکہ مجھے اپنے طور پر کام کرنا آسان ہوسکے) غالبا استعفے کے اصل راز کی طرف رہبری کرتا ہے۔ حضرت امیر **الجمعیت** نے یہ استعفا مجلس انتظامیہ میں بھیجا، مجلس انتظامیہ نے اس پر جو تجویز کی وہ حسب ذیل ہے:

نقل روداد جلسہ انتظامیہ منعقدہ ۷۔ رجب ۱۳۳۱ھ بروز جمعہ / ۱۲۔ جون ۱۹۱۳ء

اسمائے شرکا:

۱۔ مولانا مولوی سید محمد انور شاہ صاحب
۲۔ مولانا مولوی سید مرتضیٰ حسین صاحب
۳۔ مولانا مولوی شبیر احمد عثمانی صاحب
۴۔ مولانا مولوی کفایت اللہ صاحب
۵۔ مولوی عبدالسمیع صاحب
۶۔ مولوی ریاض الدین صاحب
۷۔ مولوی سراج احمد صاحب نائب ناظم

روداد:

۱۔ مولوی عبید اللہ صاحب کا استعفا پیش ہوا، مولانا عبید اللہ صاحب نے اپنے استعفے کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ اراکین مجلس انتظامیہ ان کی نسبت اچھے خیالات نہیں رکھتے اور یہ کہ بہ صورت ثبوت صفائی کے بھی کام چلانے کو مشکل خیال کرتے ہیں، اس کے متعلق غور وبحث کے بعد یہ بات طے ہوئی کہ فی الواقعہ اراکین مجلس انتظامیہ کو ناظم صاحب سے ان وجوہات سے اختلاف ہے؟

۱۔ جمعیت کے پچھلے حسابات کا اعلان صحیح طور پر نہیں ہوا ہے، بہت سی رقمیں ایسی ہیں جن کا کوئی صحیح مصرف کاغذات میں اندراج نہیں کیا، مولوی سراج احمد نائب ناظم نے جو ایک فہرست ایسی رقوم کی مرتب کر کے پیش کی تھی جس کو مولانا عبید اللہ صاحب نے پیشی کے وقت لے لیا تھا کہ اول میں اس کو دیکھ لوں گا، اس کے بعد یہ پیش ہو۔ اب اس فہرست کو دیکھا گیا، ناظم صاحب نے پینسل سے اس پر کچھ لکھ دیا ہے، وجہ بالکل ناتمام اور ناکافی ہے اور بے ضابطہ بھی، اس سے کوئی صحیح بات معلوم نہیں ہوتی، اس وجہ سے ارکان مجلس انتظامیہ کو ناظم صاحب کے ساتھ لازمی طور پر اختلاف ہونا چاہیے، اور ہے۔

۲۔ جمعیت الانصار کے ضوابط مسلمہ کے خلاف ان سے بعض ایسے امور سرزد ہوئے جس سے مدرسہ دیوبند کے قدیمی اثر کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ کہا جاتا ہے، حالاں کہ جمعیت الانصار کا نصب العین یہ تھا کہ مدرسہ دیوبند کے قدیم اثر کی توسیع اور اس کی تعلیم کی مزید اشاعت کی جائے گی۔

۳۔ جمعیت الانصار کے ضوابط مسلمہ کے خلاف مولانا موصوف سے کئی کام سرزد ہوئے جس کا کوئی صحیح جواب وہ نہیں دے سکے، مثلاً خزانے سے بغیر تحریری اجازت اراکین کی روپے لینا وغیرہ

۴۔ جمعیت الانصار اس وقت کئی سو روپے کی مقروض ہے، اس قرض کی رقوم اکثر ایسی رقمیں ہیں جو مولانا نے محض اپنی رائے سے خلاف ضوابط امور کے لیے بہ طور خود حاصل کیں اور نظامت کی وجہ سے جمعیت الانصار کے حساب میں لکھی گئیں، وگرنہ فی الحقیقت ان کی اصلی ذمہ داری ان پر عائد ہونی چاہیے۔

۵۔ نیز یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جمعیت جس قسم کے لوگوں سے مرکب ہے اور جن سے مرکب رہے بغیر جمعیت الانصار کا وضعی مفہوم باقی نہیں رہ سکتا، ان کے عملیات بلکہ اعتقادات میں بھی مولانا عبید اللہ صاحب کی جانب سے مختلف مواقع میں خلاف کا اظہار واقع ہوا ہے، جو پہلے سے بالکل نہ

معلوم تھا اور جس سے اب تک بھی بلاواسطہ بعض ارکین کو واقفیت حاصل نہیں ہے۔ اس کی تفصیل عند الضرورت ان ارکین سے معلوم ہوسکتی ہے جن کو بہ کثرت مولوی صاحب سے دینی مسائل میں گفتگو کرنے کے مواقع ہاتھ آئے ہیں۔

۶۔ مولانا عبید اللہ صاحب کی جمعیت الانصار کے امور مہمہ میں مداہنت اور تساہل اور ان کی اپنی رائے پر گزشتہ صلابت کو دیکھتے ہوئے ہم بھی انھیں کے الفاظ میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ "اگر الجامعۃ القاسمیہ تک معاملات کا مرافعہ کیا جائے اور میں اپنی برات ثابت کرلوں تو بھی اتفاق سے کام چلانا مشکل ہے۔"

اگرچہ اشکال کی وجہ ہم میں اور ان میں مختلف ہو مگر عبارا تنا شتی وحسنک واحد، نتیجہ الگ ہے۔

لہٰذا وجوہ مذکورہ بالا کی بنا پر مولانا موصوف کا استعفا آج بہ تاریخ ۷۔ رجب ۱۳۳۱ھ روز جمعہ منظور کیا جاتا ہے، لیکن جلسہ انتظامیہ ضروری سمجھتا ہے کہ مولانا عبید اللہ صاحب سے رقوم من جملہ مندرجہ کاغذات جمعیت الانصار کی تفصیل پیش کرنے کا مطالبہ جاری رکھے' اور ان کا اخلاقی اور منصبی فرض ہے کہ وہ جلد سے جلد تفصیل مطلوب دفتر جمعیت میں پیش کریں' اور وہ رقوم جن کی تفصیل مولوی صاحب موصوف کے ذمہ سمجھی جاتی ہے' مولوی صاحب کو لازم ہے کہ سابق نائب ناظم و محرر دفتر سے اس کی تفصیل حاصل کرکے پیش کریں۔

۲۔ آئندہ نظامت کے متعلق یہ رائے قرار پائی کہ جب تک جدید ناظم کا تقرر ہو' مولوی سراج احمد صاحب نائب ناظم قائم مقام ناظم ہوکر نظامت کا کام انجام دیں۔

۳۔ یہ سوال پیش ہوا کہ جمعیت الانصار کی آئندہ بقا کی کیا صورت ہو؟ اس کے متعلق سردست یہ بات تو بالاتفاق طے ہوئی کہ جمعیت الانصار اسی طرح قائم رہے' البتہ ارکین انتظامیہ قواعد اور مقاصد پر نظر ثانی کریں اور اس میں جو اثبات ومحو ہو' اس کے متعلق یادداشت آئندہ جلسے میں پیش کریں تاکہ

اس کے لحاظ سے آئندہ امور عملیہ کا انضباط ہو سکے۔

۴۔ مولوی عبید اللہ صاحب کا جو خط ۳۔ مئی کا لکھا ہوا ہے اور جس میں انھوں نے قاسم المعارف سندھ کے جاری رکھنے یا بند کردینے کے متعلق استفسار کیا ہے، پیش ہوکر یہ رائے قرار پائی کہ مولوی صاحب موصوف کو لکھا جائے کہ قاسم المعارف سندھ کی تفصیلی کارروائی دفتر جمعیت الانصار میں بھیجیں نیز اس کی آمد و خرچ کا مفصل حساب بھی روانہ کریں، اس کے دیکھنے کے بعد اس کے جاری یا بند کرنے کے متعلق رائے قائم کی جاسکے گی۔

"مضمون روداد پڑھ کر ہر ہر جملے سے اتفاق کرتا ہوں"--- دستخط کنندہ سات حضرات

"اس مضمون بالا سے اتفاق کرتا ہوں، ہاں نمبر ۳ اور نمبر ۵ سے بہ لحاظ ذاتی فہم کے پورا متفق نہیں ہوں، مگر دیگر اراکین کی رائے کو اپنے فہم ناقص پر راجح سمجھتا ہوں۔"

(دستخط) محمد سہول غفرلہ مدرس دار العلوم، دیوبند

حضرت ناظم نے اب تک استفسارات و مطالبات کا کوئی جواب عنایت نہ فرمایا، ناچار ان کی علاحدگی کا اعلان شائع کیا جاتا ہے اور حسابی کارروائی اور وجوہ مخالفت کی تفصیلی روداد ان شاء اللہ تعالیٰ بعد کو شائع کی جائے گی۔

خاکسار سراج احمد

قائم مقام ناظم و اراکین مجلس انتظامیہ جمعیت الانصار دار العلوم دیوبند

(القاسم، دیوبند۔ صفر ۱۳۳۲ھ مطابق دسمبر ۱۹۱۳ء، صفحہ ۳ تا ۸)

ضمیمہ پنجم:

اسپیچ

جو جناب سر جیمس اسکارجی میسٹن صاحب بہادر کے۔ سی۔ ایس۔ آئی۔ لفٹنٹ گورنر ممالک متحدہ آگرہ واودھ نے بمقام مدرسہ دیوبند بتاریخ یکم مارچ ۱۹۱۵ء ارشاد فرمائی۔

متولیان ومولویان وعلمائے مدرسہ دیوبند!

سالہائے فراواں سے میری یہ تمنا تھی کہ یہاں آکر بچشم خود اس مشہور مدرسہ کو دیکھوں اور اس کے ذی علم مدرسوں سے تعارف وملاقات کا مجھ کو موقع ملے۔

میری اس آرزو کی متعدد وجوہ ہیں'

اولاً ایسے علمائے متبحرین کی جو بلا امید نفع دنیوی تعلیم وتدریس میں مصروف رہتے ہیں، تعظیم وتکریم جو فطرتاً ہر تعلیم یافتہ شخص کے دل میں جاگزیں ہونی چاہیے'

دوئم وہ فخر ومباہات جو ان صوبوں کے ہر باشندہ کو اس مدرسہ کی وجہ سے کرنا چاہیے جس کی شہرت تمام ممالک ایشیا اور اسلامی یورپ میں ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے'۔

اور ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ میں تہ دل سے اس کی قدر ومنزلت کرتا ہوں کہ آپ نہایت ثابت قدمی سے محض مذہبی درس وتدریس میں مشغول رہتے ہیں اور ایسے پولیٹکل یعنی انتظام ملک کے متعلقہ مباحثات یا اور امور سے بالکل احتراز کرتے ہیں، جن سے اس ملک کے حکام کو دشواریاں واقع ہونے کا احتمال ہو۔

پس جب مجھ کو معزز دوست نواب عبد الصمد خان بہادر کے ذریعہ سے آپ کی یہ خواہش معلوم ہوئی کہ میں اس مدرسہ میں آؤں تو مجھ کو دلی مسرت

حاصل ہوئی، اور یہ مسرت اس ایڈریس کے عاقلانہ مضامین کو سن کر دوبالا ہوگئی جو آپ نے میرے خیر مقدم میں پیش کیا ہے۔ میں تہ دل سے آپ کا ممنون ہوں کہ آپ نے میرے ساتھ ایسے اخلاص ومحبت کا برتاؤ کیا اور اپنا مشہور ومعروف مدرسہ مجھ کو دکھلایا، اور اپنے کام اور مقاصد اصلی کے کچھ کچھ حالات معلوم کرنے کا مجھ کو موقع دیا۔

آج کل دنیا کے لوگوں کا میلان تین امور ناقص کی طرف ہے

اول یہ کہ لوگ بلالحاظ عقبیٰ کی راحت دائمی کے رات دن دولت دنیا کے حصول کی سعی کرتے رہتے ہیں، اور اسی ادنیٰ کام میں اپنی عقل وشعور کو جو ہمارے خالق اکبر نے بہتر مقاصد کے لیے ہم کو عطا فرمایا ہے، صرف کر دیتے ہیں

دوسرا امر یہ ہے کہ لوگ ظاہری زیب وزینت ونام ونمود کی طرف مائل رہتے ہیں اور روحانی ترقیات وبرکات حاصل کرنے کے لیے جو سچی اور واقعی نعمتیں ہیں کوئی حصہ اپنے وقت کا باقی نہیں رکھتے

تیسرا امر یہ ہے کہ لوگ مذہب کے پردہ میں تعصب کا برتاؤ کرتے ہیں اور باہمی نزاع ونفاق پھیلاتے ہیں، بجائے اس کے کہ مذہبی پند وتعلیم سے یہ بات ذہن نشین کریں کہ خداوند عالم کی نظر میں اس کے کل بندے یکساں ہیں اور سب کو باہم دگر انکسار ودرگذر کا سلوک اور اس قول پر عمل کرنا چاہیے۔

شناسند بیگانہ را ہمچو خویش
رہ آشتی را بگیرند پیش

آپ نے اپنے ایڈریس کے اس فقرہ میں جو سب سے زیادہ موثر ہے یہ تحریر کیا ہے کہ آپ ان تینوں امور ناقص سے اجتناب کلی رکھتے ہیں، اور مجھ کو یقین کامل ہے کہ اس طرح آپ اپنے طلبہ کی ایسی تعلیم وتربیت کر رہے ہیں جو دنیا وعقبیٰ دونوں جگہ ان کی راحت وخوشی کا باعث ہوگی۔

اے میرے دوستو! اور میں آپ کی نسبت لفظ دوست محض اخلاقی طور نہیں کہتا بلکہ میں فی الحقیقت مسلمانان ہند کا دوست صادق اور بہی خواہ ہوں یہ امر میری نہایت مسرت کا باعث ہوا کہ آج میں یہاں سب سے ملا اور مجھے آپ کو یہ یقین دلانے کا موقع حاصل ہوا کہ گورنمنٹ آپ کی اور آپ کے مدرسہ کی نہایت عزت ووقعت کرتی ہے۔ اگرچہ آپ کی قوم پر تکلیف ومایوسی کا زمانہ گزر رہا ہے مگر آپ ان کو ہمیشہ عاقلانہ وعظ وپند کی روشنی دکھلاتے رہے ہیں اور سچی مذہب کی تعلیم سے اس حالت افسردگی میں تسکین وتسلی دیتے رہے ہیں۔ اس طرح ان کی تکلیفیں جاتی رہیں گی اور آپ کی قوم اور گورنمنٹ جو دل سے ان کی بہبودی کی خواست گار ہے ہمیشہ آپ کی احسان مند رہے گی۔ اپنی قوم کی مدد کرنے سے آپ بعینہ ہم کو مدد دیتے ہیں اور ہمارا ساتھ دینے سے آپ ہمارے دل میں اپنی قوم کا اعتماد واعتبار قائم کرتے ہیں۔

اے میرے دوستو! میں خود تو یہ نہیں کہہ سکتا کہ کسی دنیوی طریقہ سے آپ کی امداد واعانت کرنا چاہتا ہوں کیوں کہ شاید یہ آپ کو ناگوار گزرے۔ لیکن آپ خوب جانتے ہیں کہ اگر آپ کی طرف سے کبھی امداد کی خواہش کی جائے گی تو میں کامل طور پر اور بکشادہ دلی اس کے پورا کرنے کی سعی کروں گا اور اس کو اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔

آج تو میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ میں آپ کی مہمان نوازی کا بہت شکر گذار ہوں اور میرے دل میں آپ کے کام کی نہایت عظمت وتوقیر ہے، اور میں جناب باری سے یہ دعا کرتا ہوں کہ آپ کو ہر قسم کے امور دینی ودنیوی میں ترقی حاصل ہو۔ آمین!

(القاسم، دیوبند۔ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۳ھ، صفحہ ۶ تا ۸)

ضمیمہ ششم :

افکار مسٹن

لسان العصر سید اکبر حسین صاحب پنشنر جج کے اشعار جو آپ نے ہز آنر لیفٹننٹ گورنر بہادر کے دارالعلوم دیوبند میں تشریف لانے کے متعلق لکھ کر جناب مہتمم صاحب دارالعلوم کے پاس بھیجے ہیں۔

ہز آنر حضرت مسٹن نے بے حد مہربانی کی
ہماری ہی زباں میں آپ نے گوہر فشانی کی
ثنائے عالمان دیوبند اس طرح فرمائی
ہوئی روح اس سے شاداں مدرسہ کے نیک بانی کی
یہ فرمایا کہ خالص مذہبی تعلیم ہوتی ہے
نہیں ہے فکر کچھ پولیٹکل ریشہ دوانی کی
طریق انسب یہی ہے ایسے دارالعلم عالی کو
ہوا تک لگ نہیں سکتی ہے اس کو بدگمانی کی
حیات چند روزہ ہی کی فکر اس وقت ہے سب کو
بہت کم فکر رکھتے ہیں حیات جاودانی کی
فقط لذات جسمانی کا شیدا یہ زمانہ ہے
خبر ان کو نہیں ہے روح کے راز نہانی کی
ضروری ہے کہ پیدا ہوں یہاں ذی علم ایسے ہی
کہ جو کچھ روشنی پھیلائیں عقبیٰ کے معانی کی
دلی راحت مسلمانوں نے اس ارشاد سے پائی
دوا ان کو میسر آئی دینی ناتوانی کی
ہز آنر کی ادائے شکر میں سب دل سے ہیں شامل
زبانیں دے رہی ہیں داد ان کی حق بیانی کی
یہ گو مشکل ہے حاکم کو کہ وہ درویش بن جائے
بہت دشوار وپیچیدہ ہے منزل حکمرانی کی
مگر ہے صاف ظاہر حامی مذہب ہیں ہز آنر
حقیقت منکشف ان پر بھی ہے دنیائے فانی کی

(ماہنامہ القاسم، دیوبند، جمادی الاولیٰ ۱۳۱۳ھ، ص ۱۶)

ضمیمہ ہفتم:

مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحہ

وفات: ٦۔ دسمبر ۱۹۲۹ء)

برٹش استعمار کی خدمت کے عوض ریاست حیدر آباد (دکن) کا جو منصب افتاء حضرت مولانا حافظ محمد احمد کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا جب حافظ صاحب رحہ اس منصب پر چار سال (۱۹۲۳ء تا ۱۹۲٦ء) خدمات انجام دینے کے بعد واپس تشریف لے آئے تو اب اس منصب پر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی رحہ کو فائز کیا گیا۔ جو کارنامہ حافظ صاحب علیہ الرحمہ کا نقش زریں تھا، اس کی نقش آرائی میں ذہانت اور منصوبہ بندی حضرت عثمانی علیہ الرحمہ کی کارفرما رہی تھی۔ ان کا حق تھا کہ انھیں بھی نوازا جائے اور اب انھیں نوازا جارہا تھا۔ چناں چہ اس منصب کو رونق بخشنے کے لیے ۲۲۔ جمادی الاول ۱۳۴۴ھ م ۷ر دسمبر ۱۹۲۵ء کو حضرت عثمانی صاحب مرحوم و مغفور بہ تزک واحتشام دیوبند سے دہلی اور ۲۲۔ جمادی الاول م ۸۔ دسمبر کی شب کو دہلی سے حیدر آباد کے لیے روانہ ہوگئے۔ القاسم' دیوبند کے شمارہ جمادی الثانیہ ۱۳۴۴ھ کے ادارتی صفحات میں حضرت عثمانی رحہ کے اعزاز وروانگی کی روداد چھپی ہے۔ ملاحظہ ہو:

دارالعلوم دیوبند کے مہتمم حیدر آباد دکن کے مفتی

مخدوم العلماء حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب (صدر مہتمم دارالعلوم دیوبند ادام اللہ فضلہم) نے اعلیٰ حضرت شہریار دکن (خلد اللہ ملکہ) کی تعمیل ارشاد و خوشنودی خاطر عاطر کے لیے حیدر آباد دکن کی عدالت عالیہ کی اسلامی خدمت افتاء کو قبول فرماکر چار سال بہ حسن اسلوب انجام فرمایا اگرچہ بہ زمانہ تعطیل اور دیگر ضروریات سے گاہ گاہ دیوبند تشریف فرما ہونے کی نوبت آئی لیکن مستقل قیام حیدر آباد ہی میں رہا۔ اگرچہ ضعف وامراض پہلے بھی ہوتے رہے مگر چوتھے سال میں امراض کا بہت غلبہ ہوا اور ضعف بڑھ گیا۔ اس لیے حضور عالی سے رخصت واجازت طلب فرمائی اور حضور ممدوح نے بہ کمال قدردانی و مراحم خسروانہ مناسب ومعقول منصب عطا فرماکر باعزاز تمام رخصت

فرمایا۔

حضرت ممدوح کے بعد حضور سلطان دکن خلد اللہ تعالیٰ ملکہ کی فیض اثر نظر انتخاب اس خدمت جلیلہ علمیہ دینیہ کے لیے حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند پر فائض ہوئی اور بلا کسی سعی وطلب واستدعا کے غیر مترقب طور پر آپ سے پر لطف استمزاج کر کے اس عہدہ کا آپ کے لیے تقرر کر دیا گیا۔ متعدد مشاہیر علما میں سے جس خوبی سے حضور پر نور نے یہ انتخاب فرمایا ہے وہ اعلیٰ حضرت کی نظر بالغ اور کمال بصیرت پر دال ہے۔

اگرچہ یہ انتخاب دارالعلوم دیوبند اور اس کے متوسلین کے لیے موجب مشکور ہے اور باعث مسرت اور بیش بہا اعزاز ہے لیکن چوں کہ مولانا عثمانی مدظلہم دارالعلوم کے اہتمام وانتظام کی روح رواں ہیں اس لیے آپ کی علاحدگی (اگرچہ عارضی) اکابر دارالعلوم کو نہایت دشوار نظر آئی۔ خصوصاً جب کہ حضرت صدر مہتمم سلمہم اللہ تعالیٰ بوجہ اپنے ضعف وامراض کے پوری توجہ اہتمام کی طرف نہیں فرما سکتے تھے لیکن چوں کہ حضور سلطان العلوم دام اجلالہم کی اس مرحمت اور قدر شناسی سے انکار کرنا بھی ایک قسم کی ناشکری سے تعبیر ہو سکتا تھا۔ آپ کا تشریف لے جانا ہی انسب معلوم ہوا اور دارالعلوم کا انتظام حضرت صدر مہتمم صاحب کی سرپرستی میں بدستور سابق تفویض ہوا۔ حق تعالیٰ ان کو شفاء عاجل وکامل عطا فرمائیں۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے دیوبند سے روانہ ہونے سے پہلے دارالعلوم کے علماء ومدرسین ومتعلقین کے مجمع میں ایک پر از نصائح تقریر فرمائی۔ دارالعلوم سے اپنا قدیم اور نہایت قدیم تعلق کا اظہار اور اس عارضی اور ظاہری جدائی پر قلق کا اظہار فرماتے ہوئے آپ پر رقت طاری ہوگئی جس کے اثر سے بہت سے حاضرین کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔ بہت ضبط سے کام لے کر آپ نے تقریر کو جاری رکھا اور فرمایا کہ "دارالعلوم میرے لیے بمنزلہ روح اور جان کے ہے" (یہ حضرت مولانا کا غایت انکسار ہے یا بقاعدہ علوم ادبیہ استعمال صنعت قلب ہے۔ حقیقت میں آپ مدرسہ کی روح وجان ہیں اور اگر

ہم حضرت ابن عباس رضہ کی ایک روایت کو پیش نظر رکھیں تو ہر دو حضرات مدیران باتدبیر کو جسم مدرسہ کے لیے دو روحیں کہہ سکتے ہیں ایک سیلانی اور ایک مقامی فسلمھم اللہ تعالیٰ وابقاھم ۔ فقیر راقم)

دارالعلوم کے اصاغر و اکابر اور شہر کے معزز حضرات اسٹیشن تک رخصت کرنے کے لیے حاضر ہوئے اور ایک بڑا مجمع بغرض مشایعت دہلی تک ہمراہ رہا جس میں خود حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب صدر مہتمم مدظلہم بھی بہ تقاضائے محبت و تعلق قلبی باوجود اپنے ضعف وامراض کے آخر وقت رخصت تک شریک رہے ۔

۲۲ر جمادی الاول کی شب میں حضرت مولانا دہلی سے بہ طرف حیدر آباد روانہ ہوئے ۔ اور تمام حاضرین نے آپ کو بہ قلب حزیں وچشم پرنم الوداع کہا ۔ **نستودع اللہ دینہ و امانتہ و خواتیم اعمالہ ۔**

دارالعلوم کے متعلق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کی خدمات جلیلہ کے اعتراف اور طلبہ وعلمائے دارالعلوم کے ساتھ آپ کی شفقت اور حسن معاملہ کے اظہار کے لیے ایک طویل دفتر اور مدید فرصت کی ضرورت ہے ۔ اس وقت ہم اس دعا پر ختم کرتے ہیں کہ حق تعالیٰ آپ کو باعزاز واحترام رکھ کر مدت معینہ تک حضور سلطان دکن کی دینی خدمات مفوضہ کو بہ حسن وخوبی وکامیابی انجام دہی کی توفیق عطا فرماوے ۔ اور اس عارضی جدائی کے بعد اپنے اصاغر واحباب کو اپنی زیارت وملاقات سے مشرف ومسرور کرنے کا وقت اور دارالعلوم کی ترقی وبقا کی سعی کا موقعہ عطا فرماوے اور اپنی مضطربانہ گستاخی پر حضرت مولانا سے امید عفو کی بعد یہ تین شعر پڑھتے ہیں :

بسفر رفتنت مبارکباد
بسلامت روی وباز آئی
ما بہ بگوئیم آ تو گوئی نے
آئی آئی مگر بہ ناز آئی
فضل حق لطف شاہ یار تو باد
از دکن شاد وسرفراز آئی

آمین ۱۲

مجلس یادگار شیخ الاسلام پاکستان

کی

چند یادگار مطبوعات

(۱) شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ۔ ایک سیاسی مطالعہ

(۲) شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ۔ ایک سیاسی مطالعہ

تالیفات

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

شیخ الاسلام کے مناقبِ و مقامات اور شخصیت و سیرت کے مطالعے کے لیے

(۳) مناقبِ شیخ الاسلام مولانا سید حسین احمد مدنیؒ

ترتیب

مولانا افضال الٰہی دیوبندی

تقدیم

ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری

قیمتیں: (۱)-/۹۰ روپے (۲)-/۱۰۰ روپے (۳)-/۹۰ روپے

ملنے کا پتہ

مکتبۂ رشیدیہ، عائشہ منزل، نزد مقدس مسجد، اردو بازار۔ کراچی

دار الکتاب، عزیز مارکیٹ، اردو بازار-لاہور-فون: ۷۲۳۱۱۸۰

حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمہ اللہ تعالیٰ نے کسی خارجی تحریک واثر کے بغیر توفیق الٰہی سے ذاتی مطالعہ کی بنیاد پر سکھ مت چھوڑ کر اسلام قبول کیا، ان کی خوش نصیبی یہ تھی کہ انہیں قادری سلسلہ طریقت کے معروف سندھی بزرگ حضرت حافظ محمد صدیق (بھرچونڈی ضلع سکھر) رحمہ اللہ تعالیٰ کی سرپرستی ابتدا ہی میں میسر آ گئی جنھوں نے انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا۔ (افسوس کہ حضرت حافظ صاحب قدس سرہ کے اخلاف اپنے بزرگوں کی روایات پر قائم نہ رہ سکے ان میں سے بہت سے رفض و بدعات کا شکار ہو گئے۔ اسی کا اثر وہاں کے مسلسل قتل و غارت گری ہے۔ حضرت حافظ صاحب کے بعد ان کے دو عظیم روحانی فرزندوں حضرت میاں غلام محمد دین پوری اور حضرت مولانا تاج محمود امروٹی رحمہما اللہ تعالیٰ نے اپنے شیخ کے طریقے کے مطابق مولانا کی بھرپور سرپرستی کی اسی اثنا میں انہیں دیوبند کی حاضری اور وہاں حصول علم کی توفیق میسر آ گئی، جہاں اس زمانہ میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمہ اللہ تعالیٰ کی عظیم شخصیت تشریف فرما تھی اور ان کے وجود سے ایک زمانہ استفادہ کر رہا تھا۔ مولانا سندھی نے حضرت شیخ الہند کے شیخ و مربی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ تعالیٰ سے بھی گنگوہ جا کر بڑی دیر تک استفادہ کیا۔ قدرت نے انہیں غیر معمولی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ ذہانت و ذکاوت میں ان کا جواب نہ تھا اور پھر ان کا جوش عمل ایسا تھا کہ ان کے معاصرین میں شاید ہی کوئی ان کی گرد راہ کو پہنچ سکے۔ ان کے استاد گرامی مولانا محمود حسن نے بہت سے ذمہ دارانہ کام ان کے سپرد کیے اور وہ حضرت الاستاذ کے اعتماد پر ہمیشہ پورے اترے۔

جمعیۃ الانصار کا قیام اور اس کے نظم کی توسیع، دلی میں نظارۃ المعارف القرآنیہ کا قیام اور آخر میں سفر کابل، ہمارے دعویٰ کی دلیل ہیں کہ اپنی نوعیت کی یہ بہت ہی اہم ذمہ داریاں تھیں جن کے لیے اتنے بڑے حلقہ میں اگر حضرت شیخ الہند کی نظر پڑی تو مولانا سندھی پر ان کی روشنی طبع ان کے لیے بلا بن گئی اور ان کے معاصرین نے بعض علمی مسائل کو بنیاد بنا کر انہیں تکفیر کے تیروں سے چھلنی کر دیا اور انہیں دیوبند سے نکلنا پڑا۔

دیوبند کی تاریخ کا یہ اندوہناک باب تھا۔ دیوبند ایک عظیم الشان علمی ادارہ تھا عظیم الشان علمی تحریک تھی ایک ایسی علمی تحریک جس کا مقصد مسلمانوں کے علمی ورثہ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ایسے مجاہدین کی تیاری تھی جو انگریزی سطوت کا اس ملک سے جنازہ نکال سکیں۔ ہر دیانت دار مورخ اس کا اعتراف کرے گا کہ اس عظیم علمی تحریک سے وابستہ غالب اکثریت نے بنیادی مقاصد کے حوالہ سے بڑی بہادرانہ خدامات سرانجام دیں اور حق ادا کر دیا۔ تاہم گنے چنے چند حضرات ایسے بھی تھے جو بوجوہ ان مقاصد کو ہضم نہ کر سکے اور انہوں نے خاصا منفی رول ادا کیا اس منفی رول کا ایک حصہ مولانا سندھی کے خلاف ان حضرات کا طرز عمل تھا جس سے نہ صرف مولانا سندھی کو تکلیف برداشت کرنا پڑی بلکہ حضرت شیخ الہند بھی رنجیدہ خاطر ہوئے۔

آج اس باب کا کوئی کردار زندہ نہیں، سب اپنے مالک و خالق کے حضور جا چکے ہیں۔ لیکن دیوبند کی تاریخ سے اس دور کو خارج نہیں کیا جا سکتا۔ ضرورت تھی کہ کوئی صاحب نظر اس پر محققانہ انداز سے قلم اٹھاتا اور تمام سربستہ راز سامنے لے آتا تاکہ حقائق الم نشرح ہو جاتے۔

ہمارے فاضل محقق ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے جہاں اور بہت سے انتہائی علمی اور تاریخی کام کیے ہیں وہاں اس مسئلہ کو بھی اپنی توجہ کا مرکز بنایا اور بڑی محنت سے تمام مواد جمع کر کے اس اندوہناک باب کو نئی نسل کے سامنے پیش کر دیا۔ اس تحریر سے بعض حضرات کی ناراضگی یقینی امر ہے۔ لیکن تاریخ بہرحال تاریخ ہے اس سے ناراض ہونا مناسب نہیں۔ ویسے بھی ہم اور ہمارے اسلاف سبھی غیر معصوم تھے۔ اللہ تعالیٰ مرحومین کی روحوں کو سکون نصیب فرمائے اور ہمیں صحیح راہ پر چلنے کی توفیق میسر ہو۔ آمین بحرمۃ النبی الکریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

محمد سعید الرحمٰن علوی